تیرتی لاشیں (خاص نمبر)

مصنفہ ـــــ اکرم الہ آبادی

جاسوسی دائرہ سیریز

تیرتی لاشیں

اکرم الہ آبادی

فرحت پبلیکیشنز۔ممبئی۔انڈیا

Akram Allahabadi

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

اس ناول میں شائع ہونے والے تمام واقعات،
مقامات و کردار فرضی ہیں۔ اس سے کسی طرح
کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔ جس کی مصنف،
پبلشر و پرنٹر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اس ناول کی دوبارہ اشاعت، ترجمے یا کسی اور مقصد سے استعمال کے
لئے پبلشر کی تحریری اجازت ضروری ہے ورنہ قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

پرنٹر:۔۔۔۔۔ممبئی۔انڈیا

Akram Allahabadi

پانچ سال پہلے

(داستان کے آغاز سے پانچ سال پہلے واقع ہونے والا ایک بھیانک حادثہ جو داستان کے آغاز پر تقریباً بھلایا جا چکا تھا)

دور تک پھیلی ہوئی جھیل پر پورے چاند نے اپنی چاندنی کی حسین چادر پھیلا کر جھیل کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ گرمیوں کی ایک سہانی رات تھی اور ہوا میں ایک ہلکی سی خنکی آجانے سے موسم بے حد خوشگوار ہو گیا تھا۔ جھیل کے چاروں طرف پھیلے ہوئے درختوں کے سائے، ہوا کے ہلکے جھولے، جھیل کے پانی میں جھونکوں سے اٹھنے والی ہلکی ہلکی لہریں، پتوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ، جیسے کوئی دو محبت کے مارے چھپے ہوئے سرگوشیاں کر رہے ہوں، کبھی کبھی کسی جانور کی آواز، یہ سب مل کر ایک عجیب پر کیف منظر پیش کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ منظر نہیں، بلکہ کسی شاعر کی کہی ہوئی کوئی رومانی نظم ہے۔ ایسے نشے آور منظر میں کشتی پر جھیل کی سیر کے لیے نکلنا سونے پر سہاگہ تھا۔ آٹھ نوجوانوں پر مشتمل ایک کشتی جھیل میں آہستہ آہستہ کنارے سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ پتواریں کافی تعداد میں موجود تھیں، لیکن صرف ایک ہی پتوار کا استعمال کیا جا رہا تھا اور وہ بھی بے حد آہستگی سے۔ شاید کشتی والوں کو خوف تھا کہ پتوار زور سے چلانے سے سناٹے کے دل پر چوٹ پڑے گی اور اس منظر کی نشیلی کیفیت متاثر ہو جائے گی۔ ان کی اس نزاکت سے ان کے ذوقِ نفاست پسندی اور حسین مناظر سے ان کی دلچسپی کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ سب کے سب اس منظر میں بالکل کھو سے گئے تھے۔ وہ خود بھی اس منظر کا ایک جزو بن گئے تھے۔ ان کا اپنا وجود بھی ان کے لیے ختم ہو گیا تھا، کیونکہ اس کیفیت نے انھیں بالکل اپنا لیا تھا۔

اور حقیقت بھی یہ تھی کہ یہ منظر ہر صاحب دل کو اپنا سکتا تھا۔ ہر صاحب دل پر ایک

Akram Allahabadi

نشے کی مدہوشی طاری کر سکتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہوا میں شراب گھول دی گئی ہے۔

کشتی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی اور کشتی والے بغیر شراب کے نشے میں مدہوش۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ پر کیف منظر تھوڑی ہی دیر میں ایک دلشکن، جانگسل، ہیبتناک اور بھیانک منظر میں جائے گا، جسے دیکھ کر سخت دل سے سخت دل آدمی کا بھی دل پھٹ جائے گا۔

کشتی میں تین نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں اور پانچ نوجوان لڑکے بیٹھے تھے۔ اپنے لباس سے سب کے سب اچھے اور کھاتے پیتے گھرانوں کے معلوم ہوتے تھے۔

"بھئی میں تھک گیا۔" چپوار چلانے والے لڑکے نے چپوار روکتے ہوئے کہا۔ "اب تم چپوار لو، شاکر۔"

"ناخدائی کا کام خدائی سے بھی مشکل ہے، میں انکار کرتا ہوں۔" شاکر نے جواب دیا۔

ترنم ریز قہقہوں کی ایک لہر نے سناٹا توڑ دیا۔

"چپوار تم سنبھال لو، انور۔" ایک لڑکی نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لڑکے سے کہا۔

"میں کہتی ہوں اس کی ضرورت ہی نہیں، کشتی کو انھیں ہلکی ہلکی لہروں کے سہارے بہنے دو، بڑا لطف آئے گا۔" دوسری لڑکی نے مشورہ دیا۔ اس کی بات مان لی گئی اور اب کشتی بہت ہی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، لیکن اب بھی اس کا رخ ساحل سے مخالف سمت میں ہی تھا، کیونکہ ہوا اسی طرف کی تھی۔ اب ان لوگوں نے باتیں شروع کیں۔

"اس منظر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، نسیم؟" انور نے ایک لڑکی سے پوچھا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟" نسیم نے جواب دیا۔

"مطلب یہ کہ تاج محل کی یوں تو لاکھوں دیکھنے والوں نے تعریفیں کیں اور سب نے ہی ایک سے ایک دلچسپ بات تاج محل کے بارے میں کہی، لیکن جو جان اور تڑپ اس چھوٹے سے فقرے میں ہے وہ اور کسی میں نہیں کہ تاج محل وقت کے رخسار پر ڈھلکا ہوا ایک آنسو ہے۔ اسی طرح اس سہانے منظر کے بارے میں تم کوئی فقرہ کہہ سکتی ہو۔"

Akram Allahabadi

''میں اس منظر کی کئی صحیح تعریف کر سکتی ہوں۔''نسیم نے کہا۔

''فرمایے۔''

''یہ منظر جوش کی ایک نظم ہے۔''نسیم نے جواب دیا۔

''کونسی نظم؟''خالدہ نے پوچھا۔

''بہت پرانی...وہی...

خامشی دشت پہ جس وقت چھا جاتی ہے

عمر بھر جو نہ سنی ہو وہ صدا آتی ہے

اچانک کشتی میں جھٹکا سا لگا اور اس کی رفتار بڑھ گئی۔پھر ایک جھکولا کھا کر کشتی نے رخ بدلا اور ساحل کی طرف کھسکنے لگی۔سب لڑکیوں اور لڑکوں نے خود کو سنبھالا اور کشتی کی لگر پکڑلی۔ابھی ان لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا۔اب کشتی نے ایک دائرے میں آہستہ آہستہ گھومنا شروع کیا۔سب کے سب چوکنے ہوگئے تالیاں اور گانے کی آوازیں بند ہوگئیں۔

''بھنور۔''محمود بڑے زور سے چیخا۔''یہ دیکھو۔''اس نے پانی کی طرف اشارا کیا۔

سب نے نیچے دیکھا، پانی میں بھنور پڑ رہا تھا اور بھنور کا دائرہ کوئی دس فٹ کا تھا۔دس فٹ کے دائرے کا پانی بڑی تیزی سے گھوم رہا تھا اور اس دائرے کے مرکز پر ایک گڑھا بن گیا تھا۔کشتی ٹھیک اس گڑھے پر، یعنی مرکز کے دائرے کے مرکز پر پہنچ گئی تھی اور بڑی تیزی سے گھوم رہی تھی۔خوف کی چیخیں لڑکیوں کے منہ سے نکل گئیں۔

''یا اللہ خیر۔''نسیم چیخی۔

''ارے کوئی بچاؤ۔''طاہرہ نے نعرہ لگایا۔

''کشتی کو یہاں سے نکالو۔''خالدہ نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

لڑکے بھی سب سٹپٹا گئے تھے اور خوف سے ان کی حالت بھی خراب تھی۔

''خاموش، خاموش۔''شاکر نے للکار کر سب کو خاموش کیا۔''سنو دوستو!''اس نے

Akram Allahabadi

پھر کہنا شروع کیا۔ ”مجھے ان معاملات میں سب سے زیادہ تجربہ ہے۔اس وقت تم سب میری بات سنو۔ چیخنے چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔آبادی یہاں سے بیس میل دور ہے۔وہاں تک ہماری چیخیں نہیں پہنچ سکتیں۔سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہمارے اوسان خطا نہ ہوں۔تم لوگ میری ہدایت پر عمل کرو۔شاید ہم اس مصیبت سے بچ جائیں۔“

”منظور ہے۔“سبھوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔

”چپواریں اٹھالو۔“شاکر نے ہدایت کی۔

”کوشش بے کار ہے۔“محمود بولا۔”کشتی ڈوب رہی ہے۔“

کشتی واقعی ڈوب رہی تھی۔لڑکیوں نے خوفزدہ آوازوں میں پھر چیخنا شروع کر دیا۔

”کچھ کرو،شاکر۔خدا کے لیے کچھ سوچو،کشتی ڈوب رہی ہے۔“شاہد نے کہا۔

”کشتی سے اس طرح چھلانگ لگاؤ کہ بھنور کے دائرے سے باہر گرو۔“شاکر بولا۔

”اف،میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔“نسیم چیخی۔

خالدہ اور طاہرہ کو بھی بری طرح چکر آ رہے تھے۔

”لڑکیاں کیسے چھلانگ لگائیں گی؟“شاہد نے پوچھا۔

لڑکیاں جلدی سے اپنی کمر میں ایک ڈوری باندھ کر دوسرا سرا چھلانگ لگانے والوں کو دے دیں۔“

”ڈوری کہاں ہے؟“

”ساڑھیاں کام آ جائیں گی۔پھاڑ کر اور ٹکروں میں گر ہیں لگا کر ڈوریاں بنالو۔“

”لیکن...“

”یہ وقت لیکن ویکن کا نہیں،جلدی کرو۔میں سب سے آخر میں کشتی چھوڑوں گا۔“

نسیم نے اپنی ساڑھی سب سے پہلے کھولی اور اسے پھاڑ کر گر ہیں لگانی شروع کیں۔خالدہ اور طاہرہ نے بھی یہی کیا۔لڑکوں نے اپنے منہ دوسری طرف پھیر لیے۔نسیم نے

ایک سرا اپنی کلائی میں کس کر باندھ لیا اور دوسرا سرا محمود کو دیا۔ وہ کھڑا ہوا اور دو دو تین قدم کی جھونک لے کر اس نے بڑے زور سے چھلانگ لگائی۔ وہ بھنور کے دائرے سے باہر گرا اور اب اس نے تیرنا شروع کیا۔ اچانک کئی بڑے زور کی دردناک چیخیں اسے سنائی دیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو کشتی ڈوب گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ساڑھی کا سرا تھا، اس پر بڑے زور کا جھٹکا پڑا جس کی جھونک میں وہ آگے بڑھ گیا اور بھنور کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ دو سیکنڈ بعد وہ پانی کی سطح کے نیچے تھا۔ نسیم اب ڈوب رہی تھی۔ ساڑھی اس کی کلائی سے بندھی تھی اور اسی کے جھٹکے سے محمود دوبارہ بھنور میں واپس آیا تھا۔ موت کے منہ سے ایک بار نکل جانے کے بعد وہ پھر موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔

کشتی اور اس کے آٹھوں مسافر غائب تھے۔ صرف بھنور کا دائرہ نظر آ رہا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد یہ منظر پھر بدلا۔

جھیل میں آٹھ پتواریں، ٹوٹی ہوئی کشتی کے ٹکڑے اور آٹھ لاشیں تیر رہی تھیں۔ تین لڑکیاں تھیں اور پانچ لڑکے۔ لڑکیاں نیم برہنہ تھیں اور کچھ فاصلے پر ساڑھیوں کا پھٹا ہوا کپڑا بھی تیر رہا تھا۔ ایک لڑکی کی کلائی اس کپڑے سے بندھی ہوئی تھی۔

دوپہر ہوتے ہوتے خلد آباد کے کتنے ہی گھروں سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ خلد آباد کی تاریخ میں اتنا دردناک حادثہ آج تک نہیں ہوا تھا۔ پورے قصبے میں سنسنی اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ مرنے والوں کے گھروں پر تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ خلد آباد ماتم کدہ بن گیا تھا۔

پولیس اسٹیشن کو اخباری نامہ نگاروں نے گھیر رکھا تھا، جو گیارہ بجے کی گاڑی سے خلد آباد پہنچ گئے تھے اور حادثے کی تفصیلات حاصل کرنے میں سب ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور پولیس افسران ان لوگوں سے اپنی جان چھڑانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔

Akram Allahabadi

ایک بہت ہی لمبے قد کا رپورٹر الگ بنچ پر بیٹھا ہوا سگار کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔
وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

دوسرے دن اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی کہ کشتی الٹ جانے کی وجہ سے ایک جھیل میں، جو خلد آباد سے بیس میل دور ہے، پانچ جوان لڑکے اور تین لڑکیاں ڈوب گئیں۔ یہ حادثہ رات کے وقت ہوا تھا اور لاشوں کے معائنے کے بعد ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حادثہ نصف شب کے وقت ہوا تھا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ جھیل میں کوئی مگر مچھ یا اور کوئی خطرناک جانور موجود ہے، جس نے کشتی کو الٹ دیا اور پھر کسی وجہ سے بھاگ گیا اور مرنے والوں کو نوالہ نہیں بنا سکا۔

مختلف رپورٹروں نے اپنی اپنی عقل کے مطابق حادثے کے سبب پر قیاس آرائیاں کی تھیں، لیکن دراز قد رپورٹر نے صرف اتنا لکھا تھا کہ نا معلوم اور پراسرار سبب سے کشتی کے آٹھوں مسافر لقمۂ اجل بن گئے۔

اس کے ساتھیوں کو اتنی پھیکی اور سادہ خبر پڑھ کر تعجب ہوا۔ وہ دراز قد رپورٹر اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ ہوشیار تسلیم کیا جاتا تھا۔

تین دن کے بعد وہی دراز قد رپورٹر بمبئی پولیس ہیڈ کوارٹر کے کمرۂ انتظار میں بیٹھا تھا۔

"تشریف لایئے۔" ایک کانسٹیبل نے اسے اشارے سے اندر کمرے میں جانے کو کہا۔

رپورٹر اندر داخل ہوا۔

"آداب عرض ہے، خان صاحب۔"

"آداب، آؤ بھئی، مسٹر لانگ فیلو۔ معلوم ہوتا ہے تم کوئی اہم خبر لے کر آئے ہو۔"

بمبئی پولیس کے مایہ ناز اور شہرہ آفاق سراغ رساں سپرنٹنڈنٹ پولیس حضور احمد خان نے سگار سلگاتے ہوئے لانگ فیلو کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"خبر تو معمولی ہے، لیکن اس میں کچھ باتیں پراسرار رنگ لیے ہوئے ہیں۔" لانگ

Akram Allahabadi

فیلو نے کہا۔

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔" خان نے یقین دلایا۔

لانگ فیلو نے کشتی ڈوبنے کا حادثہ جس حد تک اسے معلوم تھا، خان کو سنا دیا۔

"یہ سب تفصیل تو اخباروں میں آچکی ہے۔" خان نے کہا۔

"جانتا ہوں، خان صاحب۔ مجھے صرف ایک بات کہنا ہے اور اسی کے لیے یہاں تک آیا ہوں۔"

"کہو۔"

"شاکر اور انور دونوں بڑے اچھے اور ماہر پیراک تھے اور شاکر ڈوبتے ہوئے آدمیوں کی جان بچانے میں انعام حاصل کر چکا تھا۔"

خان یہ سن کر چونکا ہوا اور سگار کا ایک لمبا کش لیا۔ لانگ فیلو نے جلدی سے یہ بھی بتا دیا کہ ایک لڑکی کے ہاتھ میں ساڑھی کا دامن بندھا ہوا تھا۔ تینوں لڑکیوں کی لاشیں نیم برہنہ تھیں اور ساڑھیوں کو پھاڑ کر ان کے ٹکڑوں کو گرہوں سے جوڑ کر ایک رسی کی شکل بنائی گئی تھی۔ مقامی پولیس نے ان سب چیزوں کو ڈوبنے والوں کی مرتے وقت بدحواسی پر معمول کیا تھا اور اس حادثے کو کشتی الٹ جانے کا ایک معمولی حادثہ سمجھا جا رہا ہے۔

خان نے لانگ فیلو کی تمام باتیں اپنے دل میں نوٹ کر لیں۔

لانگ فیلو کے ذہن سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔

سال بھر گزر گیا، خلد آباد کے لوگ یہ واقعہ بھول گئے، اور یہاں تک کہ اب تو مرنے والوں کی یاد بھی ان کے عزیزوں کو کبھی کبھار آتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

پانچ سال بعد

جھیل کے شفاف پانی کی لہروں میں ہوا کے ہلکے تھپیڑوں سے ایک کلبلا ہٹ سی پھیلی ہوئی تھی۔ سورج سرخ ہوکر مغربی پہاڑیوں کی اوٹ میں ڈوب رہا تھا اور گنتی کے دو چار زندہ دل پکنک پارٹیاں بھی اب واپسی کی تیاری کر رہی تھیں۔ شاید آج تین سال بعد سپرنٹنڈنٹ خان پکنک کے اس پروگرام میں شریک ہوا تھا۔ وہ بھی بالے کی ضد اور مقدر جنگ کے بے حد اسرار سے مجبور ہوکر۔ مقدر جنگ کسی زمانے کے نواب اور اب بھی ایک خاصے بڑے جاگیردار تھے۔ اچاریہ ونو بھاوے کے بھودان میں اپنی زمینوں کا ایک بڑا حصہ دے کر بھی ان کی دولت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہی ٹھاٹ باٹ، وہی شان وشوکت۔ ان کی کوٹھی آج بھی خلد آباد میں 'پیلی کوٹھی' کے نام سے پہلی ہی نظر آتی تھی، جو بنائی گئی تھی ۱۹۳۲ء میں، مگر آج تک بالکل نئی معلوم ہوتی تھی۔ موٹریں، نوکر چاکر اور مقدر جنگ کی تفریحات سب اسی طرح اپنی جگہ پر تھیں۔ وہ اپنی عمر کے ۵۵ سال اس امیرانہ ماحول میں گزار چکے تھے، لیکن انھیں اپنے آپ پر بوڑھے ہونے کا شبہ تک ابھی نہیں ہوا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ خان کے خاندان سے ان کے پرانے تعلقات تھے۔ دراصل خان کے والد اور نواب مقدر میرٹھ میں اور پھر علیگڑھ میں کلاس فیلو رہ چکے تھے۔

آدمی اس عمر میں بھی بڑے زندہ دل، حاضر جواب، نفاست پسند اور حوصلہ مند تھے۔ خان انھیں چچا کہتا تھا، لیکن وہ اس سے اس بے تکلفی سے پیش آتے جیسے دوست ہوں۔ پچھلے دو سال سے وہ خان کو لگا تار دعوتیں دے رہے تھے کہ بھئی، کبھی بھولے بسرے ادھر بھی آجاؤ۔ آنکھیں ترس گئی تھیں دیکھنے کو۔ اور خان دو سال سے برابر وعدے کر رہا تھا کہ اگلے مہینے ضرور آجاؤنگا۔ بالے بھی کبھی ایک بار نواب مقدر جنگ کے یہاں خان کے ساتھ ایک ہفتے کی

تعطیل گزار چکا تھا اور اسے خلد آباد کی پر کیف فضائیں آج تک یاد تھیں ۔بمبئی کے دھاچوکڑی والے ماحول سے فرار حاصل کرنے کے بعد خلد آباد اسے واقعی کسی جنت سے کم نہیں معلوم ہوا۔ وہ خود عرصے سے خان کے پیچھے پڑا تھا کہ خلد آباد چلیے،مگر سوال تو تھا وقت ملنے کا، جو خدا خدا کر کے دو سال بعد ملا۔اور جس وقت دو ہفتوں کی رخصت آرام کرنے کی نیت سے خان مع بالے کے خلد آباد پہنچا تو گویا نواب مقدر جنگ کی کوٹھی میں نئی رونق آ گئی۔بالے اگر بچوں کی جان تھا تو خان بڑے بوڑھوں کی ناک۔رات دن سیر و تفریح، لطائف، پراسرار قصے اور پھر ان پر طرہ بالے کی مسخری حرکتیں،کوٹھی میں ایک نئی چہل پہل نظر آنے لگی۔اور تو اور، نواب صاحب کے کتے، جو اگر خط لکھنا جانتے ہوتے تو بالے کے فراق میں کم از کم ایک عدد محبت نامہ ضرور لکھ ڈالتے۔وہ بالے کو سونگھ کر بس اسی کے ہو گئے۔اس کمبخت نے انھیں گوشت کی بوٹیاں کھلا کھلا کر ان سے دوستی پکی کر لی تھی اور اب تو انھیں باقاعدہ فٹ بال کھیلنا سکھا دیا تھا۔

بمبئی میں بھی پچھلے دو تین برسوں سے خان صاحب کو کسی تفریحی پارٹی یا کسی پکنک میں شرکت کرنے کی فرصت نہ ملی تھی،لیکن یہاں جو 'بھوتیا جھیل' کا نام سنا تو اسے زبردستی ایک کد ہو گئی کہ چلو وہیں پکنک منائی جائے۔

نواب مقدر جنگ کے مصاحب خاص، میاں میر قتولی نے بھی انھیں بہت سمجھایا کہ صاحب وہ واقعی بھوتیا جھیل ہے۔خلد آباد کے لوگ کوئی ایسے بے وقوف نہیں ہیں جو جان بوجھ کر کسی جگہ سے خوف کھانے لگیں۔یہ جھیل کمبخت ہر سال میں دس بیس جانیں تو لے لیتی ہے۔ اب تو لوگ ڈر کے مارے اس طرف رخ کر کے بھی نہیں سوتے۔مگر میر صاحب کی ساری کوششیں بے سود رہیں۔بالے تو اکڑ گیا کہ وہ ایک سو ایک بھوتوں کے خلاف اکیلا ہی کافی ہے اور خان صاحب اسے میر صاحب کی عقل کا بوڑھا پن سمجھ کر صرف مسکرا کر رہ گیا۔نواب مقدر جنگ بھی کم ترقی پسند نہ تھے،وہ بھی اپنے مصاحب سے ہی بحث کرنے لگے،بلکہ جب ان کے نوکر شیخ کالو نے بھی یہی سمجھایا تو انھیں مفت میں گالیاں سننی پڑیں۔

Akram Allahabadi

بھوتیا جھیل کے تذکرے نے ضد کی شکل اختیار کر لی اور اسی دن پکنک کا پروگرام بن گیا جس میں بالے سب سے آگے تھے۔

"دو چار شیر مل سکیں تو میں اپنی بارہ بور لے لوں؟" بالے نے نواب صاحب سے پوچھا۔

"آپ کے لیے ایئر گن ہی کافی ہوگی۔ اس علاقے میں آلوؤں کے کھیت ہیں۔" خان نے اسے ٹوک دیا۔

"خیر آپ کہتے ہیں تو یہی لے لیتا ہوں۔"

چنانچہ اس نے نواب مقدر جنگ کے بڑے لڑکے اسفندیار کی ایئر گن سنبھال لی۔ نواب صاحب کا چھوٹا لڑکا تو بالے چاچا کی پیٹھ پر زین کسنے کی تیاریاں کر رہا تھا، لیکن وہ بے چارہ اتنی اونچائی تک ہائی جمپ نہ کر سکا۔

اور مقدر جنگ، بیگم مقدر جنگ، ان کی بڑی لڑکی فرزانہ، نوکر شیخ کالو، خان، بالے اور نواب صاحب کے گرانڈیل اور کوتاہ عقل بھتیجے شوکت مرزا اور اسفندیار پر مشتمل یہ پارٹی پکنک کے لیے صبح ۶ بجے گھر سے نواب صاحب کی دونوں کاروں میں روانہ ہو کر ۹ بجے تک بھوتیا جھیل پہنچ گئے۔ جنگلی چڑیل کے درختوں کے سائے میں کروندے کی جھاڑیوں کے بیچ میں پہلی نشست میں ناشتہ فرمایا گیا۔ پھر شیخ کالو تو دوپہر کا کھانا پکانے لگے۔ فرزانہ نے اپنا گراموفون نکال کر ناگن کے گانے لگا دیے۔ ایک لمبی دری ہری ہری دوب پر بچھا دی گئی اور اب سب اس ٹھنڈے ہوادار سائے میں بیٹھ کر گپیں ہانکنے لگے۔ بالے کی رگِ حماقت اور ایسے موقعوں پر نہ پھڑکے، وہ پنجے جھاڑ کر دراز قد شوکت مرزا کے پیچھے پڑ گیا اور فرزانہ کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ فرزانہ، شوکت مرزا، اسفندیار اور بالے اپنا گروپ بنا کر بیٹھے تھے۔ خان، نواب مقدر جنگ، ان کی بیگم اور نواب صاحب کے مصاحب خاص اور قدیم دوست مرزا فتولی بھی جن کا اصلی نام فتح محمد خاں جاگیردار تھا، اور جنھیں نواب صاحب اپنی جوانی کے ایام سے ہی میر فتولی

Akram Allahabadi

کہتے آئے تھے، اپنا علاحدہ گروپ بنا کر تاش کھیلنے لگے۔اس وقت جیسے انھیں بھوتیا جھیل کا خیال بھی نہ تھا، جس کے کنارے وہ پکنک منا رہے تھے۔اس مقام کی ویرانی پکنک جیسے پروگرام کے لیے کافی سکون بخش اور دل فریب محسوس ہو رہی تھی۔

بالے اس وقت ناگن کا گیت سن کر شوکت مرزا سے سانپوں کے متعلق بحث کر رہا تھا۔اس نے ابھی ابھی انکشاف کیا تھا کہ ایک سانپ ایسا بھی ہوتا ہے جس کے چار منہ ہوتے ہیں، ایک مشرق میں ایک مغرب میں، ایک شمال میں اور ایک جنوب میں، لیکن شوکت مرزا دو منہ سے زیادہ تسلیم کرنے کو تیار ہی نہ تھے۔فرزانہ بالے کا ساتھ دے رہی تھی اور اسفند یار شوکت مرزا کا۔

"اچھا فرض کرلو کہ ایک سانپ یہ ہے۔" بالے نے سُتلی کے ایک سفید ٹکڑے کو ہاتھ میں لے کر کہا۔شاید وہ سامان باندھنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

"چلیے فرض کرلیا۔" فرزانہ بولی۔

"اونہونہہ تم نہیں، بھئی۔تمہاری تو پیدائش ہی فرضی ہے۔"

"وہ کیوں؟" فرزانہ نے چڑ کر پوچھا۔

"نام جو فرزانہ ہوا۔"

اس پر شوکت اور اسفند یار فاتحانہ فرزانہ کو دیکھ کر ہنس پڑے۔

"چلیے، آپ تو بس تھالی کے بینگن ہیں۔میں نے آپ کا ساتھ دیا تو مجھ کو ہی کاٹنے دوڑنے لگے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔تم بھی بس بن گئیں۔اچھا، اس اونٹ سے پوچھو کہ فرزانہ اور فرض کی الگ الگ ہجے تو کرے۔" بالے شوکت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔اونٹ کے نام پر شوکت ایک دم بگڑ گیا۔

"خود جو ٹیٹی مرغے رکھے ہو اس لیے ساری دنیا کو اونٹ سمجھتے پھرتے ہو۔" اس

Akram Allahabadi

نے گویا موزوں جواب دیا۔

"اب یہ لیجیے، انھیں ساری دنیا ہی اونٹ نظر آنے لگی۔ اچھا بھئی، بیٹھا، بگڑنے کی کیا بات ہے؟ چلو فرض کر لیا کہ تم اونٹ نہیں ہو۔" بالے نے اس کا شانہ تھپتھپا کر اسے ٹھنڈا کرنے لگا، لیکن فرزانہ کی ہنسی نہ رکی اور شوکت اور بھڑک اٹھا۔

"تم کسی لڑکی کے سامنے میری انسلٹ کرو گے تو میں تمہارے بھیجے کا شامی کباب بنا کر کھا جاؤں گا۔" شوکت غصے میں بولا۔

"ارے واہ، یعنی کہ اتنے شوقین ہیں آپ کباب کے۔ لو بحث ہو رہی تھی سانپوں پر اور بھائی کو بو آ گئی شامی کباب کی۔"

"ہاں، بالے چاچا، آپ تو وہ چار منہ کا سانپ بتایے۔" اسفندیار نے اسے ٹوک دیا۔

"یہ بات ہوئی کچھ۔ اچھا تو لو۔ یہ رہا اس سانپ کا منہ۔" بالے نے تتلی کے ایک سرے پر گانٹھ لگاتے ہوئے کہا۔ پھر اسے ٹیڑھا کر کے بولا۔ "یہ کونسی سمت ہے؟"

"یہ مشرق۔" اسفندیار بولا۔

"اور یہ؟" بالے نے اس سرے کو مخالف سمت گھماتے ہوئے کہا۔

"مغرب۔"

"اور یہ؟" پھر اس نے اسے دائیں طرف موڑ دیا۔

"جنوب۔"

"اور اب؟" وہ اسے اس کی مخالف سمت گھما کر بولا۔

"شمال۔"

"تو بس ہو گئے چار منہ۔"

"واہ، منہ تو ایک ہے۔"

Akram Allahabadi

"بھئی یہ تو ہم نے فرض کیا تھا۔اصل سانپ تو افریقہ میں ہوتا ہے۔" بالے نے صفائی پیش کی۔

"ہونہہ،اب اس کے لیے کوئی افریقہ جائے گا دیکھنے۔" شوکت نے برا سا منہ بنایا۔

"تو پھر پالن پور کے عجائب خانے میں جا کر دیکھ لو۔"

"واہ،پالن پور میں عجائب خانہ ہے ہی نہیں۔" اسفندیار پھر بول اٹھا۔

"ہے کیوں نہیں۔ نیا نیا کھلا ہے،بلکہ ایک ویکنسی بھی ہے۔ بھائی شوکت کوشش کر سکتے ہیں۔"

"پھر وہی۔" شوکت پھر بھڑکا۔

"عجیب اخروٹ ہو یار۔ میں تو عجائب خانے کے سپرنٹنڈنٹ کی جگہ کے لیے کہہ رہا ہوں۔" بالے نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں کرنی ہے نوکری ووکری۔اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔"

"اسے حرامخوری کہتے ہیں،نواب زادے۔ وہ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی دولت ہے۔"

"تمہارے باپ دادا کی چھوڑی ہوئی تو نہیں۔" وہ غصے میں آ گیا۔

"میرے باپ دادا تو میرے لیے ایک سفید چادر اور ایک پیتل کا لوٹا چھوڑ گئے تھے کہ بیٹا سیدھے حج کرنے چلے جانا اور زیادہ غیرتمند ہو تو وہیں کہیں سمندر میں کود پڑنا۔" بالے بتانے لگا۔

فرازانہ اور اسفندیار قہقہے لگاتے رہے اور شوکت پیچ و تاب کھاتا رہا۔ان ہی دلچسپیوں میں اور جھیل کے آس پاس گھومتے شام ہو گئی،لیکن یہ دیکھ کر ان لوگوں کی دلچسپی اور بڑھ گئی کہ اس جھیل کے کنارے پکنک منانے والے صرف وہیں نہیں تھے،تین چار پارٹیاں اور

Akram Allahabadi

بھی تھیں، جنھوں نے کافی دور ہٹ کر اپنے ڈیرے جمائے تھے۔ وہ بھی کافی زندہ دل معلوم ہوتے تھے، ورنہ اس ویرانے میں پکنک منانے کیوں آتے۔

جب سورج ڈھلنے لگا اور جھیل کا شفاف پانی ہوا کے ہلکے تموج سے لہریں لینے لگا تو جھیل کے بائیں کنارے کی طرف پکنک منانے والی ایک پارٹی سے دو لڑکیاں جو کافی خوبصورت اور نوجوان نظر آ رہی تھیں اور ایک اچھی جسامت والا نوجوان تارپولین کی فولڈنگ کشتی دریا میں ڈال کر جھیل کی سیر کرنے نکل پڑے۔

"کاش اپنے پاس بھی ایک عدد ایسی ہی کشتی ہوتی اس وقت۔" بالے نے انھیں دیکھ کر آرزو کی۔

"کیا آپ تیرنا نہیں جانتے؟" فرزانہ نے کھنکتی آواز میں پوچھا۔

میں... اجی واللہ میں نے تو ۱۹۳۲ء میں بحرِ سوقیانوس تیر کر پار کیا تھا۔"

"بحرِ سوقیانوس؟" شوکت نے چونک کر پوچھا۔

"اخاہ تو اب آپ جغرافیہ میں بھی دخل دینے لگے۔ ارے بھائی، یہ بحرِ اوقیانوس کا بڑا بھائی ہے۔ چھ فٹ تین انچ طول البلد میں واقع ہوا ہے۔" بالے نے بڑی سنجیدگی سے بتایا اور فرزانہ بیچاری پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اسفندیار سمجھ گیا کہ یہ سائز خود شوکت کے قد کا ہے اور اپنا منہ دبا کر ہنسی روکنے کی کوشش کرنے لگا، مگر شوکت مرزا کی سمجھ میں اب بھی نہ آیا۔

"ہشت۔ اس نام کا کوئی سمندر اطلس میں نہیں ہے۔" شوکت نے سادگی سے تردید کی۔

"تم یار نرے چغد ہو۔ تم نے واسکوڈی گاما کا تیار کیا ہوا پرانا اطلس دیکھا ہوگا۔" بالے بولا۔

"بھ... بھ... بس کیجیے، بالے چاچا۔" فرزانہ کو ہنسی کی ہچکیاں لگنے لگیں۔

"اوہ، تم تو مذاق اڑا رہے ہو میرا۔" شوکت اب سمجھا۔

Akram Allahabadi

"کون اُلو کا پٹھا کہتا ہے یہ۔" بالے نے کہا۔ "میں تو ثابت کرسکتا ہوں۔"

"تو تمہیں ثابت کرنا ہوگا گھر چل کر، ورنہ میں تمہاری چٹنی بنا دوں گا۔" شوکت نے غصے میں کہا۔

"منظور۔ اور ثابت ہوگیا تو پھر میں تمہارا مربہ بنا دوں گا۔"

"منظور۔" شوکت نے بھی ہاتھ مار دیا۔

"لو، کمبخت، کتنے مزے سے سیر کر رہے ہیں بھوتیا جھیل کی۔" بالے نے جھیل میں تیرتی ہوئی اس کشتی کو دیکھ کر کہا۔

"کوئی بھوت نکل کر لپٹ جائے تب مزا آئے سالوں کو۔" اسفندیار نے بوڑھوں جیسی باتیں کرتے ہوئے کہا۔

"چہ، بھوت ووت کیا ہوتا ہے؟" فرزانہ نے اسفندیار کو جھاڑ سنائی۔

"ہوتا ہوگا، تب ہی لوگ کہتے ہیں۔ کیوں ہے نا شوکت بھائی؟" اسفندیار نے شوکت سے گواہی طلب کی۔

"ارے ایک سے ایک بھوت پڑا ہے اس دنیا میں۔ وہ قبلہ نانا ابا نہیں سناتے تھے سر کٹے بھوت کا قصہ۔" شوکت بچوں جیسے انداز میں شروع ہوگیا۔

آ... ہاں ہاں۔ ابھی ذرا ٹھہرو۔" بالے نے اسے روکا اور جیب سے ایک چاکلیٹ نکال کر جو وہ نواب صاحب کے چھوٹے بچے کے لیے لایا تھا، شوکت مرزا کو دے دی۔

"پہلے اسے چوسو پھر کہنا۔" فرزانہ کھل سے ہنس پڑی اور اسفندیار بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں ابھی تمہیں ٹھکانے لگاتا ہوں، برخوردار۔" شوکت بگڑ کر آستین چڑھاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"شوکت۔" دوسری طرف سے نواب صاحب کی ڈانٹتی ہوئی آواز سنائی دی۔

Akram Allahabadi

"جی، چچا حضور۔"

"کیا بیہودگی ہے یہ؟"

"دیکھیے کب سے یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔"

"مذاق بھی کوئی پتنگ ہے جو میں اڑاؤں گا۔ ذرا آپ ہی ملاحظہ فرمایئے، قبلہ۔" بالے اس پر بھی نہ مانا۔

"بھئی، دوستی ہے تو پھر یہ لڑنا کیسا؟ ہنسی مذاق تو سب ہی کرتے ہیں۔" نواب صاحب نے شوکت کو ہی سمجھایا۔

"اچھا اب چپ بیٹھ جا میرے یار، لے معاف کر دے۔" بالے نے اسے شانوں سے پکڑ کر بچوں کی طرح چمکارنے لگا اور اس گرانڈیل ۲۸ سالہ بچے کا غصہ پانی ہو کر مسکراہٹ میں بدل گیا۔

ارے ارے، وہ کیا؟ دیکھیے، خان چچا۔" اسفندیار دور ہی سے جھیل میں تیرتی ہوئی کشتی کی طرف اشارہ کر کے چیخا۔ وہ سب چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

کشتی بیچ پانی میں پہنچ کر اس طرح ناچ رہی تھی جیسے کسی موٹر کا پہیہ۔ نہ جانے کس طرح اور کب وہاں اچانک گرداب پیدا ہو گیا تھا۔ کشتی پر بیٹھنے والے صاف نظر نہیں آتے تھے، مگر ان کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اچانک کچھ چھینٹے اڑے، گرداب کی گردش کچھ اتنی تیز تھی کہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ بالے کپڑے پہنے پہنے ہی پانی میں کود پڑا۔ خان نے بھی بش شرٹ اتار کر جست لگائی اور پانی میں پہنچ گیا۔ اُس طرف سے ان لوگوں کے ساتھیوں میں سے بھی دو مرد جھیل میں کود کر تیرتے ہوئے گرداب کی طرف دوڑے، مگر جھیل کافی بڑی تھی اور وہاں تک پہنچنے میں کم از کم پانچ سات منٹ ضرور لگتے۔

ان کے دیکھتے ہی دیکھتے گرداب تھمنے لگا اور رفتہ پانی کی سطح پھر پر سکون ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ چاروں اس جگہ پہنچ گئے، لیکن اس جگہ کوئی بھی

Akram Allahabadi

آثار ایسے نہ تھے جن سے اس سے پہلے یہاں گرداب کا تصور بھی کیا جا سکے۔ بالے اور خان دونوں ہی اچھے تیراک تھے۔ جھیل کافی گہری تھی پھر بھی انھوں نے کئی بار غوطے لگا کر تہ میں ڈوبنے والوں اور ڈوبی کشتی کو تلاش کیا، مگر وہ خود بھی حیران رہ گئے کہ وہاں کچھ نہ تھا۔ وہ کافی دور تک غوطے لگا لگا کر ڈھونڈتے رہے، مگر خدا جانے اس کشتی اور کشتی والوں کو زمین کھا گئی تھی یا آسمان۔ کہیں ان کا نام ونشان بھی نہ تھا۔

جب وہ تلاش کر کے تھک گئے تو واپس لوٹے۔ نواب صاحب کا خاندان کنارے پر کھڑا ان کا بیقراری سے انتظار کر رہا تھا اور انھیں صحیح سلامت لوٹتے دیکھ کر بچے خوشی سے چلا اٹھے۔

بالے اور خان کی طرح وہ دوسرے دو آدمی بھی مایوس لوٹ گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ سب کے سب ان کی طرف آنے لگے۔ شاید وہ انھیں شریک غم کرنا چاہتے ہوں۔

"کیا نہیں ملے وہ لوگ؟" نواب صاحب نے پوچھا۔

"مجھے خود حیرت ہے کہ انھیں زمین کھا گئی یا آسمان۔ ہم نے تو تہ تک چھان ماری، کہیں پتا نہیں۔" خان نے گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

"عجیب بات ہے۔ ضرور یہ گرداب بھوت ہی تھے، ورنہ یہ طلسم جیسا واقعہ کیوں ہوتا؟" بیگم مقدر جنگ نے بھی خوفزدہ انداز میں رائے دی۔ "آخر گرداب اچانک کیوں پیدا ہوا اور صرف ان کو ہی لے کر کہاں غائب ہو گیا۔" وہ سوچ سوچ کر کہنے لگیں۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" خان نے سر کو جھٹکا۔ "میں تو بھوتوں وتوں کا قائل نہیں نہیں، لیکن یہ واقعہ تو بالکل عجیب وغریب ہے۔ میں خود نہ انھیں ڈھونڈتا تو شاید یقین نہ کرتا لوگوں کی روایات پر۔" وہ تذبذب میں ڈوبا ہوا بولا۔

"بھئی، کچھ بھی ہو، یہاں سے تو اب جلدی چلیے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ یہ وحشتناک مقام ہے۔" بیگم مقدر جنگ پریشان ہونے لگیں۔

Akram Allahabadi

"پہلے تو تولیہ لے کر آپ سر خشک کر لیجیے اور اب ہمیں سیدھے گھر چلنا چاہیے، ورنہ آپ لوگوں کے بھیگے کپڑے آپ کو بیمار نہ ڈال دیں۔" نواب مقدر جنگ نے کہا۔

اتنے میں اس دوسری پکنک پارٹی کے لوگ بھی قریب آ گئے۔ وہ کل سات آدمی تھے۔

"کیا آپ لوگوں کی سمجھ میں آئی یہ بات؟" ان میں سے ایک نے نواب صاحب سے دریافت کیا۔

"خدا جانے یہ بھوتوں کا مقام ہے یا جنوں کا۔ ہم تو خود پہلی بار آئے ہیں یہاں۔" نواب صاحب سٹپٹاتے ہوئے بولے۔

"پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" دوسرا آدمی سپرنٹنڈنٹ خان کی طرف رخ کر کے بولا۔

"آپ لوگ سب سے پہلے قریب ترین پولیس اسٹیشن پر رپورٹ لکھوایے۔" خان نے بھیگے بال تولیے سے خشک کرتے ہوئے مختصراً جواب دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ میں ہی وہ اپنا سارا سامان اکھٹا کر کے بھوتیا جھیل سے روانہ ہوئے۔

☆☆☆☆☆☆

تتا وان، تتا وان، اٹھیے۔ تتا وان اٹھیے۔" نواب مقدر جنگ کا چھوٹا لڑکا اشرف مرزا خان کو سوتے میں آ کر جھنجھوڑنے لگا۔

"آں... ہاں... کیا ہے، بیٹے؟" خان نے کروٹ بدل کر پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"باٹے تتا کو بھوت ہو دیا۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

Akram Allahabadi

"بھوت ہوگیا ہے؟"

"ہاں، عثا وان، چلیے نا۔" وہ خان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔

"چلتے ہیں، بیٹے، چلتے ہیں، گھبراؤ نہیں۔" یہ کہہ کر خان اسی طرح گون پہن کر سلیپریں پاؤں میں ڈال کر اس کے ساتھ ہولیا۔

بالے باہر کے کمرے میں تھا۔اس نے ساری کوٹھی میں اودھم مچا رکھا تھا۔بچے سہمے سہمے نظر آرہے تھے۔خود بے چارہ شوکت مرزا گھبرایا ہوا تھا۔صرف فرزانہ ایک کونے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔خان کو دیکھتے ہی وہ سنجیدہ ہوگئی۔نواب صاحب اور بیگم صاحب شاید دونوں اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔یہاں زیادہ سے زیادہ نو بجے سب سو جاتے تھے،لیکن جب سے خان اور بالے یہاں مہمان آئے تھے،تب سے دس اور گیارہ بھی بج جاتے۔کم از کم بالے کو تو اس سے پہلے فرصت نہ ملتی۔تمام بچے اسے گھیرے رہتے اور وہ انھیں لطیفے اور کہانیاں سناتا رہتا۔

خان جب کمرے میں داخل ہوا تو بالے آنکھیں چڑھائے منہ ٹیڑھا کیے ایک ایک کو بندر کی طرح کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔

"خرررر...خوں خوں...خیاؤں...خیں..." وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو شیر کے پنجے کی طرح اکڑا کر شیخ کالو پر جھپٹا۔

"ہائے، مرا سرکار۔ارے، مجھے بچایئے۔" کالو چیختا ہوا بھاگا اور خان سے ٹکرا گیا۔

خان بالے کی طرف گھورنے لگا۔

"سرکار، جب سے جھیل سے لوٹے ہیں یہی حال ہے۔ضرور بھوت سوار ہوگیا ہے اس پر جھیل کا۔" شیخ کالو نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

"جاؤ ہوگیا ہے۔تمہارے باپ کا اجارہ۔ہم ایک سو بار ایک ہزار بار سوار ہوئینگا۔" بالے ناچتے ہوئے بولا۔ساتھ ہی وہ بڑی بڑی آنکھیں نکال کر شیخ کالو کو گھورنے لگا۔بیچارہ کالو

بری طرح سہم گیا۔

"شیخ کالو، ہم تمہارا لالو کھیت بنا کر کچالو سے کھائینگا، پھر آئی بہار گائینگا۔ تم سالا بھوپ۔" یہ کہہ کر اس نے شیخ کالو کا بازو تھام لیا۔

"ارے سرکار، مجھے کوئی بچایے۔ ہائے رے بھو بھوت نے مجھے بھی پکڑ لیا۔" وہ چیخنے لگا۔

مگر کس کی ہمت تھی جو اسے چھڑانے کے لیے آگے بڑھے۔ بالے نے کیفیت ہی ایسی بنا رکھی تھی کہ جسے دیکھ کر اس میں شبہ نہ رہے کہ واقعی اس پر کوئی بلائے بد سوار ہو گئی ہے اور خان اس تماشے میں ابھی ہاتھ دینا نہ چاہتا تھا۔

"تم کاہے کو چیختا، مین۔ ہم تم کو حلال کدھر کیا، ابھی تو دیر ہے۔" بالے نے کہا اور اس کی گردن میں ہاتھ دے کر اچھلنا شروع کیا۔ لیکن خان کو گھورتے دیکھ کر بھوت پھر دوسری طرف گھوم گیا۔ شیخ کالو اب شوکت مرزا کی طرف دیکھ کر دہائی دے رہا تھا۔ اس دراز قد آدمی سے نہ رہا گیا تو شیخ کالو کی ہمدردی میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔

چھوڑ دیجیے نا بالے صاحب۔ بیچارہ غریب آدمی مر جائے گا۔"

"بالے صاحب؟ یہ کون چغد کا پٹھا ہوتا ہے؟" بالے نے آنکھیں چڑھائے اسے ٹوکا۔ "ہمارا نام کو در پریل ہے۔" اور پھر چھپی ڈانس کی طرح کمرے کے بیچ میں ناچ ناچ کر گانے لگا۔ "جھک جھک جھک جھک آئی ریل... آدھا گھی اور آدھا تیل... پیچھے پڑا لوی بیل... میرا باپ جھینگا پٹیل... میں اس کا بیٹا لوور پریل... لوور پریل... چھک چھک... چھک چھک... کوکوکوکو.. اواو..."

پھر اچانک وہ گاتے گاتے رک گیا اور بڑے غور سے شوکت مرزا کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس نے کوئی عجیب چیز دیکھ لی ہو۔

"ہیلو، مائی ڈارلنگ، تم کب آیا؟ ٹکٹ لیا کہ نا ئیں؟ اچھا بیٹھو بیٹھو۔ ہم تمہارے

Akram Allahabadi

اوپر سوار ہوکر کان پور چلینگا۔وہاں دھیڑیا مسان میں ہمارا اکٹھا کھاندان چنا بھونتا ہے۔"

"بالے بھائی، ہوش میں آیے۔" شوکت اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

"تم ڈارلنگ ہم کو چھوڑ کر بھاگنے مانگتا، ادھر ہم گریٹ ورلڈوار میں تمہارا واسطے لڑ کر مارا گیا ادھر تم..."

"بالے بھائی۔" شوکت حلق پھاڑ کر چیخا۔

"کیوں بے، کس کا بائی، کیسا بائی؟" یہ کہہ کر وہ اِدھر اُدھر اور شوکت کی ٹانگوں میں جھانک کر دیکھنے لگا۔

"ہشت... سالا لوگ، بائی بولتا۔ہم بائی نہیں ہونے کا، ہم بابا ہے۔تم ہمارا مسان مرگھٹ پر آئینگا تو ہم تمہارا آملیٹ بنا کر اپنی برادری کو کھلائینگا۔" یہ کہہ کر شوکت کے گلے کا ہار بن گیا۔شوکت مرزا کا برا حال تھا۔کمبخت بالے بھی اتنی سنجیدگی سے بھوتیایا ہوا تھا کہ بچے ہنسنے کے ساتھ ساتھ خوفزدہ بھی ہوئے جارہے تھے۔

"کسی بیرے کا بھوت معلوم ہوتا ہے بالے چچا پر۔" نواب صاحب کے ننھے لڑکے نے حیرتناک چھوٹا سا تبصرہ کیا۔

"ڈارلنگ سکھٹ۔" بالے نے شوکت کو زبردستی بازو میں تھام کر فرزانہ کی آنکھ بچاتے ہوئے شوکت کا گال کاٹ لیا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے؟"

"ہودگی وودگی ہم نہیں جانتا۔تم کو ہمارے ساتھ ڈانس کا بال روم کرنے کا ہے، نہیں تو ہم تمہارے سر پر دو جنم کے لیے سوار ہو جائے گا۔" وہ اسے زبردستی اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔ شوکت کچھ تو دہشت زدہ تھا اور کچھ بالے کے مقابلے میں کمزور بھی پڑتا تھا۔بالے نے اسے کمر سے اونچا اٹھا کر کمرے میں ناچنا شروع کردیا۔

Akram Allahabadi

"بس اب ہم تم پر عشق ہو گیا۔" یہ کہہ کر اس نے دھڑام سے شوکت مرزا کو کمرے میں بچھے ہوئے ایک صوفے پر پٹک دیا۔ شوکت کی ہڈیاں چرچرا گئیں۔ بچے بے اختیار ہنس پڑے، لیکن چونکہ ڈر انھیں بھی تھا، اس لیے دور سے ہی سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

"بھاگیے، شوکت بھائی۔" فرزانہ کی آواز سنائی دی۔ "بھوت کو آپ سے عشق ہو گیا ہے۔ خدا خیر کرے۔" اور شوکت بوکھلایا ہوا دوسرے کمرے کے دروازے میں گھس کر ہانپنے لگا۔

"سرکار، بڑا خطرناک بھوت معلوم ہوتا ہے۔" شیخ کالو نے ایک کان کی لو تھامتے ہوئے حیرتناک الفاظ میں کہا۔

"ناک سے خطر نہیں ہے۔ تم جھوٹ بولتا، شیخ کالو۔ تمہارا دادا بھڑ بھونجا تھا، تم ادھر شیخ بنتا، بولو سچی کہ جھوٹی؟"

"سچ ہے، بھوت بابا، سچ ہے۔" شیخ کالو کانپ کر بولا۔

"تم بازار کی سبزی سے چونی روز چوری کرتا، بولو، سچی کہ جھوٹی؟" وہ شیخ کالو کے سر پر پہنچ کر بولا۔

"سچی، بابا۔" شیخ کالو نے تسلیم کیا۔

"تم بابا لوگ کا بسکٹ مار کر کھاتا، بولو سچی کہ جھوٹی؟"

"سچی، بھوت صاحب۔"

"صاحب نہیں، ہم ہندوستانی بھوت ہے۔" بالے نے اسے ڈانٹا۔

"مہاراج۔" شیخ کالو کی گھگھی بندھ گئی۔ غالبًا بالے نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ ہی تھا۔

"مہاراج نہیں، ہم ڈیما کریٹک بھوت ہے۔" بالے نے پھر آواز بدل کر اسے ڈانٹا۔

خان سے اب ہنسی ضبط نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے رومال منہ پر رکھا ہوا تھا۔ بچے ہنس

Akram Allahabadi

پڑنے کے موڈ میں تھے، لیکن کیونکہ سوال و جواب سنجیدہ نوعیت اختیار کر چکے تھے، اس لیے وہ اِدھر اُدھر، دور دور چھپے سن رہے تھے۔

"ڈمار کٹک بھوت صاحب۔" شیخ کالو نے اورڈر کر اپنی زبان کے مطابق اس کی توصیف دہرائی۔

"اچھا تو ہم کو خان بولو۔" بالے نے کانی آنکھ سے کمرے کے ایک دروازے کے پاس مدھم روشنی میں کھڑے سپرنٹنڈنٹ خان کو دیکھ کر کہا۔

"او سور۔" خان کی ہلکی قہقہہ لگاتی ہوئی آواز بچوں کی ہنسی میں خلط ملط ہو کر سنائی دی۔

"تم ہم کو سور بولا؟" بالے پھر شیخ کالو پر بگڑ گیا۔

"ہم... ہم... میں... ایسا کیسے بول سکتا ہوں۔" شیخ کالو کی پھر گھگھی بندھ گئی۔

"اچھا تم ہمارے لیے ایک من مرغی کا دودھ لاؤ، تب ہم تم کو معاف کرے گا۔" بالے نے اس سے مطالبہ کیا۔

"مرغی کا؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں، جاؤ، جلدی جاؤ۔" وہ چیختا ہوا اس کے پیچھے دوڑا اور ملا شیخ کالو بیچارہ رہ جانے کا اشارہ پاتے ہی دوڑ کر کمرے کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

فرزانہ کا برا حال تھا۔ وہ اپنی ہنسی روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ خان بھی اس ڈرامے میں لطف لینے لگا۔ اور خان کو خاموش پا کر بالے کا دیوانہ پن اور بڑھ گیا۔ شیخ کالو اسی وقت بستی کے مشہور بھوت پکڑ ملا بکری کو لینے چلے گئے اور اتفاق سے ملا بکری اس وقت واحد غائب بھی نہ تھے۔ نواب صاحب کا نام سنتے ہی چاروں ہاتھ پاؤں سے تشریف لے آئے۔ اندر گھستے ہی سب سے پہلے بالے نے ایک آنکھ بند کر کے جیسے ہی دیکھا، ملا جی گھبراہٹ میں الٹا لاحول ولا پڑھنے لگے۔

Akram Allahabadi

"یاقوۃ ولاحول...ویاحول ویاقوۃ...لاحول...اونہونہہ...ولاحول ولاقوۃ..."

بالے نے ایک آنکھ بند کر کے ان کے سامنے افریقہ کے جنگلیوں جیسا ناچ شروع کردیا اور ناک سے منمنانے لگا۔

"سیاں توری گود میں گینڈا بن جاؤں گی...گا...گی گا ہو...گی گا...گا ی گا...گی گا...گی گا..." پھر وہ ایک عجیب انداز سے مٹکتا ہوا ملاجی کے قریب پہنچ گیا اور ایک انگلی اٹھا کر باریک آواز میں بولا۔ "ارے موئے بکرے تو کہاں آگھسا ہمارے گھر میں؟"

فرزانہ سے ضبط نہ ہوسکا تو وہ پردہ ہٹا کر پچھلے کمرے میں چلی گئی اور پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگی۔ اس کے باریک قہقہے خان کو سنائی دے رہے تھے اور خان خود بھی مشکل سے ہنسی روک رہا تھا، البتہ شیخ کالو، اسے بالے کی زیادہ بگڑتی حالت سمجھ کر اور پریشان ہو رہے تھے۔

"ملاجی، کچھ کیجیے نا، ورنہ سارجنٹ صاحب کو کچھ ہوگیا تو بڑا بُرا ہوگا۔" وہ ملاجی سے درخواست کرنے لگے۔

"اہم...ہوں...بڑ ڑرر..." ملاجی نے کھانس کر گلا صاف کیا اور آہستہ سے شیخ جی سے بولے۔ "میاں، بھوت کچھ ایسا ویسا نہیں معلوم پڑتا، پڑھے لکھے پر آیا ہے، ضرور داؤ پیچ سے واقف ہوگا۔ خیر، لیتا ہوں سالے کو آڑے ہاتھ۔" یہ کہہ کر انھوں نے جیب سے ماش کی دال کے کچھ دانے نکالے اور چند سیکنڈ منہ سے کچھ بڑبڑانے کے بعد زور سے بالے کے منہ پر کھینچ مارے۔

بالے نے کھوکیائے ہوئے بندر کی طرح بتیسی نکال دی اور ملاجی پر جھپٹ پڑا۔

"ابے ڈگرو بھیا، کہاں مرگیا تھا جا کے تو؟ میں کب سے صدقے کا بکرا مانگ رہا ہوں، سالے۔" منمنی آواز میں یہ کہہ کر اس نے ملاجی کا گریبان تھام لیا۔

"ارے ارے، یہ کیا بیہودہ...ہو...ہودگی ہے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ...لاحول ولاقوۃ...لاحول ولاقوۃ..." ملاجی اپنی جان بچانے کے لیے اور تیز تیز لاحول پڑھنے لگے، لیکن

Akram Allahabadi

بالے نے دونوں کہنیوں سے ان کا چہرہ ہتھیلیوں میں بھر کر پٹاخ سے ایک بوسہ لے لیا ان کے داہنے داڑھی دار رخسار کا۔

''اہا... پھل بجوا پھل بجوا... ناچ نچوا ناچ نچوا... کوا کوا... کوا... کوا... ہوا ہوا...'' وہ پھر ناچنے لگا۔ ایک بھوت کی نامعلوم نفسیاتی وحشت کے اثر کے باوجود بچوں کے پیٹوں میں ہنس ہنس کر بل پڑے جا رہے تھے۔ بالے اچانک اپنا ناچ روک کر پھر ملا بکری کی طرف مخاطب ہوا۔

''ملا جی۔'' اس نے منمنی آواز میں کہا۔ ''اپن تو تم پر عاشق ہو گیا بس۔'' وہ اپنے ہاتھ ڈھیلے کر کے ملا جی پر آ گرا اور اپنی بانہوں کی گرفت یکا یک اتنی سخت کر لی کہ ملا بکری گھبرا گئے۔

''ارے، لاحول ولاقوۃ الا باللہ، چھو... چھو...'' وہ اس کے منہ پر پھونکنے لگے۔ مگر اس پر اثر جو ہو۔ ''کالو رام تیلی، تیرے منہ میں گڑ کی بھیلی... ہو جا اڑن چھو، نہیں تو بنا دوں گا الو۔'' ملاں جی نے ایک منتر بھی چیپ ڈالا۔

''ملا جی، آپ نے حجامت کب سے نہیں بنوائی؟'' وہ دونوں ہاتھ کمر پر باندھ کر ان سے پوچھنے لگا۔

''ابے کیا بکتا ہے، نامعقول۔ کیا کسی حجام کا بھوت ہے؟'' ملا جی نے اپنی آواز میں زبردستی کی کرختگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ ان کی آواز خود کانپ رہی تھی۔

''ملاں جی، میں آپ کی ذات بتا رہا ہوں۔'' وہ منمناتے ہوئے عجیب سا منہ بنا کر بولا۔ ملا جی کے چہرے کا رنگ اس وقت پھیکا سا پڑ گیا۔ شیخ کالو یہ دیکھ کر قریب گئے۔

''ملا جی، یہ تو سب سچ سچ بتا دیتا ہے، کسی نجومی کا بھوت تو نہیں؟'' انھوں نے آہستہ سے ملا جی کے کان میں کہا۔

''ایسا...؟ تو لیتا ہوں خبر ابھی بیٹا کی۔'' ملا جی نے آستین کے ساتھ پائنچے بھی چڑھا

لیے اور نیا منتر جپنے لگے۔

"تال تال... آگیا بیتال... تیری ادھیڑ دوں ساری کھال، نہیں تو بدل دے اپنا خیال، ہو جائے گا جی جنجال۔ چھو منتر چھو..." یہ کہہ کر ملاجی نے ماش کے چند دانے بالے کے منہ پر بھی مارے۔

بالے نے کسی مذبح خانے کے بکرے کی طرح حلق سے ایک بھیانک آواز نکالی۔ ملاجی دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"اب پڑی ہے مار بیٹا کو۔" شیخ کالو نے ڈینگ ہانکتے ہوئے کہا۔

"ملاں آں آں آں جی... ای ای..." بالے نے غیر مانوس آواز نکالی۔ "میں سنڈاس جا رہا ہوں۔ اوں... ابھی آ کر تم سے کشتی لڑوں گا۔ آں..." خان کی ہلکی سی ہنسی چھوٹ گئی، مگر کوئی سن نہ سکا۔

"جا جا، جلدی آ۔" ملاجی شیر ہو گئے اور بالے بیہوش ہو کر صوفے پر گر پڑا۔

"ہائے اللہ، بالے چچا کو کیا ہو گیا، چچا جان؟" فرزانہ نے خان کو پردے کے پاس کھڑے دیکھ کر پچھلے دروازے سے قریب آ کر گھبراتے ہوئے کہا۔

"بس دیکھے جاؤ چپ چاپ۔" خان مسکرا کر بولا۔ "وہ آج ملاجی کا ہی بھوت بھگا کر چھوڑے گا، بہت سو رہے۔" خان نے آہستہ سے کہا۔ مگر بچے سب پریشان ہو رہے تھے۔ بالے کی بیہوشی نے انھیں متفکر کر دیا تھا۔ ملاجی اتنی دیر برابر ماش کے دانے ہاتھ میں لیے بدبداتے رہے، لیکن ان کے ہاتھ کانپتے نظر آ رہے تھے۔ نواب صاحب کی ڈیوڑھی کے باہر بھی بستی والوں کا ایک چھوٹا سا مجمع ملاجی کے بھوت بھگانے کی خبر سن کر اکٹھا ہو گیا تھا اور نتیجے کا منتظر تھا۔

یکا یک بالے کو ہوش آ گیا۔

"ملاں جی۔" وہ منمنا کر بولا۔ "میں رفع حاجت کر کے آ گیا، اب آ جاؤ میدان

میں۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے ایک جست کی اور ملا جی کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

’’ارے ارے، علم سے کشتی لڑو، علم سے متتر ہے، یہ ہاتھا پائی کیسی؟‘‘ ملا جی گھبرا کر بولے۔

’’آج میں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ شفاء العین والعین بنا دوں گا، ملاں جی۔‘‘ وہ ان سے باقاعدہ پہلوانوں کے سے انداز میں پینترے بدلتے ہوئے بولا۔

’’اور تمہارا خون اوٹو سویٹ ڈریم بنا کر اپنے بازار میں بیچوں گا۔‘‘

’’باپ رے، یہ تو کچھ بگڑ گیا معلوم ہوتا ہے۔‘‘ ملا جی آپ ہی آپ زیرِ لب بڑبڑائے۔

’’چلو آؤ، کلا جنگ۔‘‘ اور یہ کہہ کر بالے نے ملا جی کا ایک ہاتھ تھام کر سر کے اوپر سے لیتے ہوئے ہلکے ہلکے ملا جی کو اس طرح پھینکا کہ وہ کونے میں بچھی ہوئی گدے دار پلنگ پر جا گرے۔ انھیں بہر حال چوٹ تو نہیں لگی، لیکن چوٹ کھانے والے انداز میں منہ بناتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

’’بڑے سخت جان بھوت سے پالا پڑا ہے، شیخ جی۔‘‘ انھوں نے ایک ہاتھ سے کمر دبائے شیخ کالو سے کہا۔

’’یہ آپ ہی کا دم خم ہے، ملا جی، جو ایسے خطرناک بھوتوں کے سرداروں سے لڑ رہے ہیں۔‘‘

’’اب کی بار دھوبی پاٹ ماروں گا، ملاں جی، ذرا سنبھل کے آنا۔‘‘ بالے نے للکارا۔

اور ملا جی ڈرے ڈرے سے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ان کی حالت اس وقت عجیب ہو رہی تھی۔ اگر شکست تسلیم کر کے بھاگتے ہیں تو ملائی خطرے میں اور اگر نہیں بھاگتے تو... یہ اپنی نوعیت کا پہلوان بھوت خاصی مرمت کر ڈالے گا۔ بالے نے

Akram Allahabadi

اب کی بار ان کا ہاتھ تھامتے ہی اپنا گھٹنا ٹیک کر انھیں اپنی پیٹھ پر سے اڑا کر صوفے پر پٹک دیا۔

"اہاں... اب مزا آئے گا بچو کو ہم بھوتوں سے لڑنے کا۔"

ملا جی بیچارے دل میں خدا سے پناہ مانگ رہے تھے اور منہ سے لاحول پڑھ رہے تھے۔ صوفے پر بھی انھیں اس طرح پھینکا تھا اس نے کہ چوٹ بہر حال نہیں آئی تھی، البتہ چوٹ کی دہشت ضرور سوار ہو گئی تھی۔

"بڑا غیر مہذب بھوت ہے، کسی چمار کا معلوم ہوتا ہے۔" ملا جی پھر بڑبڑاتے ہوئے اٹھے۔ "اب کی بار اگر اس سے تو بہ نہ کی تو ملا بکری میرا نام نہیں۔"

"ہائے غضب، یہ کیا ہو گیا بالے بھائی کو۔" بیگم مقدر جنگ اچانک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

"سرکار، وہی جھیل کا کوئی بھوت سوار ہو گیا ہے صاحب پر۔" شیخ کالو نے مؤدب ہو کر ڈرے ہوئے لہجے میں عرض کیا۔

"بھوت..." بیگم صاحبہ چونک کر بولیں۔ "ہائے اللہ تو کچھ کرو نا جلدی۔"

"ملا بکری کو لایا ہوں، حضور۔ بڑے اچھے بھوت مار عالم ہیں۔" شیخ کالو نے ملا بقرعیدی کی تعریف کی، جنھیں بستی کے جاہل لوگ اختصار کے ساتھ ملا بکری کہا کرتے تھے۔ اور یہ خطاب ملا جی کی ان پڑھ لیاقت کے مطابق تھا۔

"آداب عرض کرتا ہوں، سرکار۔" ملا جی نے فرشی سلام پیش کیا۔ "حضور، بہت خطرناک بھوت ہے۔ بڑی محنت کرنی پڑے گی، سرکار۔ کشتی لڑنا پڑی ہے اس بھوت سے۔" ملا جی عرض کرنے لگے۔

"پھر آجا میدان میں، بکرے کی اولاد۔ میرا نام بھی گھسیٹا رام گھاس والا ہے۔ گھسیٹ گھسیٹ کر ماروں گا تجھے۔" بالے نے ملا کا ایک ہاتھ پکڑ کر چیلنج کیا۔ اپنی آنکھیں اس نے بھینگی کر لی تھیں۔

Akram Allahabadi

"ارے ارے، ابے کیسا بدتمیز بھوت ہے۔ ٹھہر ٹھہر، بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر ملا جی نے پھر جیب سے ماش کے دانے نکالے، ان پر کچھ پڑھا اور پھر بالے کے چہرے پر مارتے ہوئے کہا۔ "بن جا بیٹا مرغا... ملا بکری کا حکم ہے... نہیں تو تیری سات پیڑھی کو سات سمندر پار رڑی پار کردوں گا۔" یہ کہتے ہوئے ملا جی کی آنکھیں جلال سے سرخ ہوگئیں۔

بالے نے ایک بار ان کی شکل مبارک دیکھی اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر اسکول میں جس طرح بچے مرغا بنائے جاتے ہیں، اسی طرح مرغا بن کر ککڑوں کوں... ککڑوں کوں چیخنے لگا۔ اب تو نواب صاحب کے بچے بھی جو سہمے ہوئے دور سے تماشا دیکھ رہے تھے، ڈر کے باوجود ہنسی نہ روک سکے۔

"آہا... دیکھا... آخر آیا نا قابو میں۔ حضور، اس کمبخت کے چلیے میٹ کردوں گا۔" ملا جی نے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھ کر دعوا فرمایا۔

"سرکار، ملا جی کے آگے تو ہزار بھوت پانی بھرتے ہیں۔" شیخ کالو نے پھر تعریف فرمادی اور پھر چپکے سے ملا جی کے کان میں بولے۔ "کیوں ملا جی، رہا کمیشن۔" ملا جی نے اثبات میں گردن ہلادی۔

"بول تیرا اصلی نام؟" ملا جی نے پھر ماش کے دانے بالے پر مار کر پوچھا۔

"طوطا رام۔"

"باپ کا نام؟"

"مینا رام۔"

"جھوٹ۔" ملا جی نے پھر ماش کے دانے مارے۔

"تو بلبل رام سہی۔" بالے نے کہا اور ہنستے ہنستے لوگوں کا برا حال ہوگیا۔

ملا جی پھر حاضرین پر بگڑ گئے۔

"یعنی کہ آپ لوگ ہنس رہے ہیں، وہاں اتنا خطرناک بھوت اس بیچارے کے سر

پر سوار ہے۔" ملاجی نے سب کو ڈانٹ پلائی۔

"ہاں تو، سالے ذلیل ناپاک طوطا بھوت، تم ہمارے مہمان کے اوپر کیوں آئے؟"

"اوپر نہیں نیچے آیا ہوں، ملاجی۔" بالے منمناتے ہوئے بولا۔

"مجھے آپ جیسا ایک بکرے کی بھینٹ چاہیے۔"

"ہائیں..." ملاجی چونک پڑے۔

"میں اسے چھوڑ کر اب تمہاری خبر لوں گا۔ تم نے میری برادری کے بہت سے بھوتوں کو ستایا ہے۔" کہتے ہوئے منمنا کر کھڑا ہو گیا۔ ملاجی گھبرا کر بغلیں جھانکنے لگے۔ تھوڑی دیر میں بالے کمرے میں پڑی ہوئی میز سے اچک کر ملاجی کے کندھوں پر سوار ہو گیا۔

"لو سوار ہو گیا میں تم پر، اب بتاؤ الو کے پٹھے۔ چل میرے گھوڑے... تخ تخ تخ..."

اور پھر بالے نے ملاجی کے کندھے پر بیٹھ کر انھیں، کان اینٹھ کر، بال کھینچ کھینچ کر کمرے میں چکر لگوانے شروع کیے ہیں تو خان کو بھی رومال منہ پر رکھ کر ہنسی چھپانی پڑی۔ اسی وقت اتفاق سے بیگم صاحبہ کی نظر دروازے کی دہلیز سے لگ کر دھندلکے میں کھڑے ہوئے سپرنٹنڈنٹ خان پر پڑ گئی۔

"ہائے اللہ، ارے آپ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں اور یہاں یہ کچھ حال ہے۔"

انھوں نے بڑے اچنبھے سے خان کو ٹوکا۔

"گھبرائیے نہیں، ابھی جب بھوت مجھ پر سوار ہو گا تو اس کا بھوت خود بخود اتر جائے گا۔" خان یہ کہہ کر آگے بڑھا۔ بالے اسے دیکھتے ہی ملا بکری کے کندھے سے کود کر باہر کی طرف بھاگا۔

"کہاں چلے طوطا رام؟" خان نے پیچھے سے ہنس کر آواز دی۔

"ذرا جھاڑا پھرنے جا رہا ہوں۔ اگلے سال اسی وقت آؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے بالے نے کمرے سے نکلنا ہی چاہا تھا کہ خان نے پیچھے سے گریبان تھام لیا۔

Akram Allahabadi

"کیوں بے، الو، کیا حرکتیں لگائی ہیں یہ؟ سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔" خان نے اسے دبی زبان سے ڈانٹا۔

واہ صاحب، اچھا انصاف ہے یہ۔ ایک تو میں نے اتنا دلچسپ تماشا دکھایا سب کو اور اوپر سے آپ چلے گردن ناپنے۔ ذرا، بھائیو، سفارش کرو نا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" بالے تمام بچوں کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"ہاں، چچا جان، چھوڑ دیجیے۔" سب نے ایک زبان ہو کر سفارش کی، جس میں فرزانہ بھی شامل تھی۔

"اچھا، ایک بار معاف کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر خان نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ سب ہنسنے لگے اور بیچارے ملا بکری دم دبا کر کھسک گئے۔ شیخ کالو کا کمیشن کھاتے میں آ گیا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

اڑی ٹانگ

صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی بالے نے خان کو آگھیرا۔

"میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا ہے۔" وہ بولا۔

"اگلیے۔" خان نے کہا۔

"یہ کہ آپ ان بھوتیا جھیل کے بھوتوں سے مباذرطلبی کرنے والے ہیں...اور بندہ آپ کی سایہ عاطفیت سے استعفاوے کرکھسک رہا ہے۔"

"اور میں نے بھی ایک خواب دیکھا ہے۔"

"ارشاد۔"

"کہ آپ کی کھوپڑی میں ایک بھی بال نہیں ہے۔"

"بعض خوابوں کی تعبیر الٹی ہوا کرتی ہے۔"

"میں سیدھی کر لیتا ہوں۔"

"تو پھر میرا خواب واپس۔" بالے نے ہتھیار ڈال دیے۔

"اب واپس نہیں کیا جائے گا۔اب تو مجھے بھوتیا جھیل سے دلچسپی لینے ہی پڑے گی۔" خان نے اپنے مخصوص فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"آپ خوامخواہ کسی کے چھٹے میں ٹانگ گھسیڑ رہے ہیں۔چہ نسبت پولیس را بہ عالم بھوت۔" بالے نے اسے اپنی زبان میں سمجھانے کی کوشش کی۔

"ویسے بھی پندرہ دنوں کی یہ چھٹی بیٹھے بیٹھے بور ہو جائے گی۔پھر جرم ہی کیا ہے جو تفریح ہی رہے۔" خان نے طریقے سے اسے سمجھایا۔اسی وقت نواب صاحب مع بیگم کے آکر پاس کی کرسیوں پر جم گئے۔

"کیا سازشیں ہو رہی ہیں، بھئی؟" وہ انھیں چھیڑتے ہوئے بولے۔

"اب آپ ہی سمجھایئے انھیں، قبلہ۔ فرما رہے ہیں بھوتیا جھیل پر مکان بنوائیں گے۔" بالے بول اٹھا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔" نواب مقدر جنگ نے اسے مذاق سمجھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، قبلہ۔ دراصل کل کا واقعہ میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ اس لیے خواہ مخواہ میرا ذہن الجھ رہا ہے۔ اب جب تک میں اس راز کو سمجھ نہ لوں مجھے چین نہ آئے گا۔ کشتی ڈوبی تو کیوں ڈوبی؟ اور گئی تو کہاں گئی؟" خان نے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔

"مگر خلل آئی جی، وہ گرداب کا معاملہ ہے، واب بیٹھا تو..." بالے نے ٹوکا۔

"مجھے کام کے معاملے میں نخرے پسند نہیں۔" خان نے اسے گھور کر کہا۔

"یہ لیجیے، یہاں بھی کام۔ جنابِ عین زبر عا... لام یے زیر لی... ہم یہاں رخصت پر ہیں، کام پر نہیں ہیں۔"

"تو پھر آج سے تمہاری رخصت ختم۔"

"چہ خوش... کل آپ فرمائیں گے کہ پرسوں سے تم ختم۔" بالے بحث کرنے لگا۔

"تمھیں ساتھ نہیں رہنا ہے تو واپس جا سکتے ہو، میں اسرار، ابراہیم یا ہارون کو بلا لوں گا۔" خان نے لہجے میں سنجیدگی پیدا کر لی۔

"ارے وہ چغد کے سلسلے بھوتوں سے لڑیں گے بھلا؟" بالے نے حیرت کا اظہار کیا۔ نواب صاحب اس عجیب جملے پر ہنس پڑے۔ بیگم بھی مسکرا کر رہ گئیں۔

"تو تم لڑو گے؟"

"آپ جوش دلائیں گے تو میں ابھی جا کر لڑ جاؤں گا۔"

"بس بس، اتنی بہادری کافی ہے۔ آپ اپنا بوریا بستر گول کیجیے۔ میں ان لوگوں کو

بلاتا ہوں۔"

"بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔ میں نہیں جاتا۔ یہ خوب مہمان بلا کر گھر سے نکلواتے ہیں۔" بالے مچل کر پھر وہیں بیٹھ گیا۔

لیکن میاں، تم کروگے کیا وہاں جا کر؟ وہاں کوئی ہو بھی تو اس سے نمٹا جائے۔ چلو میں بھی بندوق لے کر چلوں، مگر وہاں تو خالی خولی جھیل پڑی ہے۔" نواب مقدر جنگ نے کہا۔

"ایسے طلسموں کی جان کسی الو کے پٹھے میں ہوتی ہے، قبلہ۔"

"اور اس الو کے پٹھے کو تلاش کرنا پڑے گا؟" بالے نے پھر پوچھا۔

"بھئی، یہ طلسم ہوشربا جیسی باتیں اپنی سمجھ میں نہیں آتیں، تم جانو تمہارا کام، مگر جو کچھ کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ خود کو کسی خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔" نواب صاحب نے ایک مشفق بزرگ کی طرح انھیں نصیحت کی۔

"آپ اطمینان رکھیے، قبلہ۔ خان صاحب خطروں کے باپ ہیں۔ خطرہ تو صرف اس چیز کو ہو سکتا ہے جس کی دو بیویاں اور آٹھ عدد بچے بیوہ اور یتیم ہو جائیں گے۔" بالے نے منہ بسور کر فریاد کی۔

"ارے، تو تم نے دو شادیاں کب کی تھیں؟" بیگم مقدر جنگ نے حیرت سے پوچھا۔

"بکتا ہے، اس کی تقدیر میں تو سرے سے بیوی لکھی ہی نہیں گئی۔" خان بیچ میں بول اٹھا۔ "اتفاق سے کوئی پیغام بھی آتا ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ ابھی دودھ پیتا ہے، جب جوان ہوگا تو دیکھا جائے گا۔" وہ بولا۔ نواب اور بیگم دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور بالے۔ "آئی واک آؤٹ۔" چیختا ہوا باہر نکل گیا۔

"کچھ بھی ہو بھئی لڑکا اچھا ہے۔" نواب صاحب نے رائے دی۔

"فرزانہ کی منگنی نہ ہوئی ہوتی تو میں ضرور ایسے خوش مذاق داماد کے لیے غور کرتی۔"

Akram Allahabadi

بیگم صاحبہ نے کافی بے تکلفی سے فرمایا۔

"فرزانہ کی منگنی...؟ کہاں کی گئی ہے؟" خان نے چونک کر پوچھا۔ "اور ہمیں آپ نے خبر بھی نہ کی۔"

"میاں، بس ایسے ہی جلدی جلدی میں ہوگئی، ورنہ تمہیں اور نہ پوچھتے۔ ویسے شادی تمہارے بغیر ہونے سے رہی۔" نواب صاحب بولے۔

"کس کے ساتھ ہوئی؟"

"وہ ہمارے دور کے ایک خاندانی عزیز نواب سعادت جنگ، خدا بخشے انھیں، ان کے ہی اکلوتے لڑکے ہیں سطوت مرزا۔ دن تو وہ پہلے جیسے نہیں رہے، پھر بھی خاصا کاروبار ہے ان کا۔ سنا ہے کلکتہ میں ایک ایکسپورٹ امپورٹ کی فرم ہے۔ جوٹ کے ایک مل کے حصے دار ہیں۔ دہلی اور کانپور میں ایک ایک ہوٹل ہے اور یہاں سے کچا مال بھی بھیجتے ہیں۔" نواب صاحب نے تعریف کر ڈالی۔

"بس ان ہی کو بہت پسند ہیں، ورنہ اور کیا کمی ہے ان میں۔ مجرے کے شوقین، وہ موٹی بلا منہ لگی جسے زہر قاتل کہتے ہیں اور اسی پر بس نہیں... کسی زمانے میں کوکین سے بھی شوق فرماتے تھے۔ ہر وقت منہ سے بدبو آتی تھی۔ میں نے خود ایک بار ٹوکا تو رفتہ رفتہ چھوڑ دی۔" بیگم نے بتایا۔

"ارے بھئی، یہ تو نوابوں کے شغل ہیں، ورنہ نواب کیسے؟" نواب صاحب نے اپنی مونچھوں کے دونوں سرے اینٹھ کر آسمان کی طرف کرتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا۔

"خیر کچھ بھی سہی، مگر کم از کم ان سے ایک بار ملایئے ضرور۔ ہم بھی دیکھیں اپنی فرزانہ کے ہونے والے شوہر نامدار کو۔" خان نے اصرار کیا۔

"ہاں ہاں، ضرور، میں کل ہی بلوا بھیجتا ہوں۔ ویسے تو وہ خود ہی ہفتے میں ایک آدھ چکر ضرور لگا لیتے ہیں۔" نوابصاحب نے بتایا۔

Akram Allahabadi

"میں تو کہتی تھی اپنا شوکت ہی کیا برا ہے، مگر یہ جو سنیں۔" بیگم نے کسی قدر روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وہ بوژم۔ ارے بیگم، اسے تو بوڑھے ہو کر بھی جو عقل آجائے تو جانیں۔ لڑکی کی تقدیر پھوڑنی ہے کیا۔" نواب صاحب نے ان کی تردید کردی۔

"کیا اس علاقے میں پٹ سن بھی پیدا ہوتا ہے، میرا مطلب ہے جوٹ؟"

"سنا ہے وہ کھیتی تو اسی کی کرواتے ہیں، اب کتنا ہوتا ہے کتنا نہیں، یہ وہ جانیں۔" نواب صاحب نے بتایا۔

"چلیے، اچھا ہی ہوا جو ہوا۔ آپ لوگوں نے بھی کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔" خان نے کہا۔

"ہاں تو میاں، اب تم ان بھوتوں کا کیا کرو گے؟" نواب نے پھر اصل معاملے پر آتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایک کشتی اور غرق کرنی ہے وہاں۔" خان نے بتایا۔

"یعنی دو چار آدمی اور مروانا چاہتے ہو تم؟" نواب صاحب نے چونک کر کہا۔

"بھئی، پہلا واقعہ تھوڑی تھا ایسا، اس سے پہلے اسی شہر کے ایک رئیس ہیں لالہ رام سنگھ، ان کا جوان لڑکا مع اپنی نئی نویلی بیوی کے بھوتیا جھیل کے گرداب کی نذر ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے ایک سوئمنگ کلب نے وہاں میچ مقرر کیا تھا اور اس کلب کی دو لڑکیاں، ایک آشا اور دوسری کا نہ جانے کیا نام تھا، اچانک اسی گرداب میں غرق ہو گئی تھیں۔ میرے خیال میں تو ایسے کل ملا کر درجن دو درجن واقعات ہو گئے ہوں گے یہاں۔ اور تو اور خود سطوت مرزا کے ایک بہت گہرے دوست کی نوجوان بیوی، جس کے حسن کی لوگ مثالیں دیتے تھے، مع اپنے شوہر کے اسی جھیل میں غرق ہو گئی اور سطوت مرزا اور دوسرے دوست کنارے کھڑے چیختے رہ گئے۔"

نواب صاحب بتاتے چلے گئے اور خان غور سے سب کچھ سنتا رہا۔

Akram Allahabadi

"غالباً ان میں سے کسی کی لاشیں ابھی نہیں ملی ہوں گی؟" خان نے پوچھا۔

"سنا ہم نے بھی یہی ہے۔" نواب نے بتایا۔

"بھئی، بڑی عجیب ہے یہ بھوتیا جھیل، خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔" بیگم توبہ کرنے لگیں۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ وہ بھوت چھانٹ چھانٹ کر لے جاتے ہیں۔" خان مسکرایا۔

"اب اللہ جانے کمبخت کیا کرتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں اس سرزمین پر کوئی تو اللہ کا بندہ ہو، ایسا جوان مجنوں کو زیر کر سکے، سب ہی دور بھاگتے ہیں۔ اور تو اور، ایک پولیس انسپکٹر بھی تو بیچارہ ڈوب چکا ہے۔" نواب صاحب نے بتایا۔

"اچھا۔" خان نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، بھئی۔ وہ بیچارہ کارکردگی کے جوش میں اس طلسم کا پتا لگانے لنگوٹ باندھ کر چلا گیا تھا۔ پانی اور گرداب نے لیا ہے تو پھر نام و نشان نہ ملا۔"

"کیا آپ نے خود دیکھے تھے یہ واقعات؟"

"اجی لاحول بھیجو۔ بھلا ہم کہاں جاتے ہیں ایسی جگہوں پر۔ وہ تو تمہاری ضد سے ہم بھی چلے گئے کہ ہو سکتا ہے سب افسانے ہوں، مگر کل جو دیکھا تو مان گئے کہ بھوت بھی کچھ ہوتے ہوں گے۔" نواب صاحب نے فرمایا۔

"اچھا دیکھیے، ایک بات مانیں گے میری۔" خان بولا۔

"ایک نہیں سو کہو جی۔"

"ابھی انھیں یہ نہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں پولیس افسر ہوں۔ خواہ مخواہ میں نہیں چاہتا کہ اس طرح کسی سے ملوں۔ لوگ اس میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔" خان نے کہا۔ "بعد میں جب بے تکلف ہو جائیں گے، تو دیکھا جائے گا۔"

"ہاں ہاں، اس میں کیا حرج ہے۔ سن لو بھئی، بیگم، تم بھی۔ ابھی سے کتنا خیال ہے اپنے ہونے والے بہنوئی کا۔" نواب صاحب نے ہنس کر کہا۔

"بچوں اور نوکروں کو بھی ہدایت کر دیجیے گا کہ میرے اور بالے کے بارے میں نہ کہیں کہ ہم لوگ پولیس آفیسر ہیں۔ اچھا اثر نہ پڑے گا اس کا۔" خان نے کہا۔

"مگر تمہارے نام جو شیطانوں کی طرح مشہور ہیں؟" نواب صاحب نے پوچھا۔

"تھوڑا تھوڑا سا بدل لیں گے۔ مثلاً میں منصور احمد خاں اور بالے ... مجھے اقبال احمد۔" خان نے بتایا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ ذرا لطف رہے گا۔" نواب صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

چنانچہ اس تجویز کے مطابق کوٹھی میں بچوں سے لے کر خادموں تک کو سمجھا دیا گیا اور سب نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے منہ میں لگام رکھیں گے، تاوقتیکہ انھیں بھانڈا پھوڑنے کی اجازت نہ مل جائے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

عجیب فون

پرسوں کی بھوتیا جھیل والے واقعہ کی خبر آج اخباروں میں کافی سنسنی خیز تبصروں کے ساتھ شائع ہوئی تھی، لیکن ان طرح طرح کی قیاس آرائیوں میں بھی بھوتیا جھیل کی اہمیت برقرار تھی اور اخباروں نے بھی اس بات پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ آخر جھیل میں بھنورا چانک اور کسی خاص موقع پر کیسے آتا ہے۔ پولیس نے اپنے غوطہ خور کانٹوں کے ساتھ پانی میں چھوڑ کر جھیل کی پوری تہ تلاش کر ڈالی تھی، لیکن وہاں زمین میں کائی، کیچڑ اور الجھی ہوئی چند جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس حد پر پہنچ کر پولیس کی عقل نے بھی ہتھیار ڈال دیے تھے اور لے دے کر شبہ اس بات پر تھا کہ یا تو کوئی بہت پراسرار گروہ، جو انسانوں کو کسی خاص مقصد کے لیے اغوا کر رہا ہو، اپنے غوطہ خور پانی میں چھپے رکھتا ہوگا اور وہی کسی طریقے سے بھنور پیدا کر کے آدمیوں اور کشتی کو نیچے کھینچتے ہوں گے اور نیچے سے ہی انھیں پانی کے اندر گھسیٹتے ہوئے کسی کنارے نکال کر غائب کر دیتے ہوں گے۔ یہ بات بہت خفیف سی تُک رکھتی تھی، لیکن قابلِ یقین بھی نہ تھی۔ خان نے اکتا کر اخباروں کو میز پر ڈال دیا۔ ادھر سے نواب مقدر جنگ سگریٹ منہ میں دبائے آ پہنچے۔

”کیا سوچ رہے ہو میاں؟ وہ برخوردار کا پیغام آیا ہے کہ آپ کے مہمان سو میرے مہمان۔ آج شام کو ان کے یہاں ہم سب کی دعوت ہے۔“ نواب صاحب نے کرسی پر جمتے ہوئے خان کو بتایا۔

”جیسی آپ کی مرضی۔“ خان نے جواب دیا۔ مگر پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے نواب مقدر جنگ کی طرف مخاطب ہو گیا۔

”نواب صاحب، یہ جھیل والے واقعات یہاں کب سے شروع ہوئے ہیں؟ کچھ اندازہ ہے آپ کو؟“

Akram Allahabadi

"بھئی، ٹھیک سے نہیں، لیکن سنا ہے کہ دو تین سال سے ایسا ہو رہا ہے۔ لوگ کہتے کہ دو تیلی ایک دن جھیل میں نہاتے ہوئے ڈوب مرے تھے اور تب سے بھوت بن گئے۔ وہی یہ اندھیر مچائے ہوئے ہیں۔" نواب صاحب نے داستان گو انداز میں بتایا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ کیا فضول روایات ہیں۔"

"تو اور پھر کچھ تم بتاؤ۔"

"ابھی تو بتانا مشکل ہے، لیکن بھوت پریت تو بہر حال بکواس ہے۔ یہ ضرور کوئی دوسرا ہی معاملہ ہے۔" خان نے کہا۔

"خیر ہوگا، ہمیں کیا؟ تو ہاں، پھر تم تیار رہو گے نا؟ اور ربالے کہاں گئے؟"

"ہوگا کمبخت کہیں بچوں میں یا پھر آپ کے کتوں سے کھیل رہا ہوگا، گہری دوستی کر لی ہے ان سے۔" خان نے ہنس کر کہا۔

"کچھ بھی ہو، ہے بڑا زندہ دل لڑکا۔" نواب صاحب نے تعریف کی اور اٹھ کر چل دیے۔

☆☆☆☆☆☆

شام کو وہ سب سطوت مرزا کے بنگلے میں موجود تھے۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد اس وقت بنگلے کے برآمدے میں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں ہو رہی تھیں۔ نواب مقدر نے سپرنٹنڈنٹ خان کا تعارف بحیثیت ایک دور کے زمیندار کے منصور الحق کے نام سے اور ربالے کا اقبال کے نام سے کرا دیا تھا۔ سطوت مرزا ان سے بڑے اخلاق سے پیش آیا۔ کیونکہ نواب صاحب نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ ہمارے خاص عزیزوں میں ہیں۔ وہ قوی الجثہ ہنس مکھ، لیکن کسی قدر خوفناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کی آنکھیں سرخ اور باہر کی طرف نکلی ہوئی تھیں اور خدا جانے کیوں فرزانہ شاید اسے پسند نہیں کر رہی تھی۔ وہ جب للچائی ہوئی نظروں سے اس کی

Akram Allahabadi

طرف دیکھتا تو وہ رخ دوسری طرف کر لیتی۔بالے خاموشی سے بیٹھا ان دونوں کی اس کیفیت کا مطالعہ کر رہا تھا اور خان باتوں میں لگے ہوئے اس گھر اور اس کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ آج کل کے سیاسی حالات، معاشی مشکلات اور پھر اخلاقی قدروں پر گفتگو کرتے رہے۔پھر کچھ گھریلو معاملات پر بات چیت چلنے لگی۔بالے نے نہ جانے کیوں اب تک خاموش تھا۔وہ فرزانہ کی پاس والی نشست پر بیٹھا تھا اور یہ چیز غالباً سطوت مرزا کو ناگوار گزر رہی تھی۔وہ باتیں کرتے کرتے بار بار رک کر ادھر دیکھنے لگتا، مگر دوسروں نے اس کیفیت کو محسوس ہی نہیں کیا اور ایسے موقع پر بالے بھی جان بوجھ کر لاپرواہ بن جاتا۔خان نے سطوت مرزا کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر بات بدل دینے میں اسے ذرا دیر نہیں لگتی۔وہ دور دراز کے حالات پر بھی نظر رکھتا ہے اور بعض سائنسی معاملات میں بھی اسے دخل ہے۔

غروب آفتاب میں ابھی کچھ منٹ باقی تھے کہ اندر سے اس کے نوکر نے آ کر کہا۔

"صاحب، آپ کا فون ہے۔"

سطوت مرزا مہمانوں سے چند منٹ کی غیر حاضری کی معافی مانگ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اتفاق سے اسی وقت سپرنٹنڈنٹ خان کو بھی پیشاب کے لیے جانے کی ضرورت ہوئی۔سطوت مرزا کے جاتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔نواب مقدر تو یہاں پہلے کئی بار آ چکے تھے، انھوں نے اشارے سے خان کو پیشاب خانے کی سمت بتا دی۔یہ انگریزی طرز کا پیشاب خانہ اندر پیچھے کی طرف واقع تھا۔نوکر کوئی سامنے نہ تھا، ورنہ رہنمائی کرتا، اس لیے اسفندیار ہی کھڑا ہوا۔

گیلری سے گزرتے ہوئے اسفندیار نے اسے اشارے سے بتایا کہ یہ بھائی صاحب کا پرائیوٹ روم ہے۔

خان سر ہلا کر رہ گیا۔لیکن جس وقت وہ اس کمرے کی ایک کھڑکی کے قریب سے گزرنے لگے تو خان ٹھٹک کر رہ گیا۔سطوت مرزا اندر کسی کو فون کر رہا تھا۔

"یہ کیسا فون ہے؟" اس نے آہستہ سے کہا اور کھڑکی سے کان لگا کر سننے لگا۔ اندر سے فون پر سطوت کی آواز آ رہی تھی۔

"ہاں ہاں... چھ آنکھیں.. اچھا بابا... چھ چینی.." وہ فون پر سن کر کاغذ پر لکھتا جا رہا تھا۔ "لیور...۲/۳... ہاں ہاں نوٹ کر لیا.. بیضے ۱۶... چھوٹے صرف ۱۲ ملیں گے... ایک بہت کمزور ہے... ہاں ہاں ٹھیک ہے... کیش... ہاں یہیں ملے گا... ہاں فائنل۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور وہ کاغذ جس پر اس نے پنسل سے نوٹ کیا تھا جیب میں رکھ لیا۔ خان اسفندیار کو لے کر آگے نکل گیا۔

جب وہ لیٹرین سے لوٹا تو سطوت مرزا نواب صاحب کے ساتھ موجود تھا اور خان کو اس طرف سے آتے دیکھ کر کچھ چونکا، لیکن لاپروائی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ خان بھی چپ چاپ بیٹھ گیا، لیکن اسفندیار سے ایک بہت بڑی حماقت سرزد ہو گئی۔ وہ بول پڑا۔

"بھائی صاحب، یہ آپ فون پر آنکھیں، بیضے کیا کر رہے تھے؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ خان ٹپٹا گیا کہ کہیں وہ اس کا بھی ذکر نہ کر دے۔

"ایں... اوہ... ارے وہ پاگل چاچا کا فون تھا۔ وہ یوں ہی اوٹ پٹانگ بکا کرتے ہیں اور میں انھیں بہلانے کے لیے ہاں میں ہاں ملا دیتا ہوں۔ مگر تم وہاں کیسے پہنچ گئے تھے۔"

"میں چچا جان کو لیٹرین دکھانے جا رہا تھا تو آپ کی آواز کان میں پڑ گئی۔" اسفندیار بیوقوفانہ سچ بولا۔

"ارے، تو نوکر کو بلوا لیا ہوتا۔" سطوت مرزا نے ایک جھوٹی اور مشکوک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں، اپنا ہی گھر ہے۔" نواب صاحب نے بات بنا دی۔

☆☆☆☆☆☆

اور رات کی دعوت کھانے کے بعد جب نواب مقدر اور ان کے گھر کے لوگ اور خان اور بالے واپس لوٹ رہے تھے تو خان نے نواب مقدر کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ فرزانہ کے لیے سطوت مرزا کو پسند نہیں کرتا۔ نہ جانے کیوں سطوت مرزا اسے اچھا آدمی نہیں معلوم ہوا۔ نواب صاحب سن کر فکر میں کھو گئے۔ بیگم نے بھی سن لیا تھا، وہ بھی سنجیدگی سے سوچنے لگیں، کیونکہ وہ لوگ جانتے تھے کہ خان کبھی غلط مشورہ نہیں دے سکتا۔ وہ جو کچھ کہے گا بہت سوچ سمجھ کر کہے گا اور اس کی کوئی بات بے وجہ نہیں ہوتی۔ البتہ فرزانہ نے جب کار کی اگلی نشست سے جہاں وہ شوکت مرزا کے ساتھ بیٹھی تھی، ان کی باتیں سنیں تو اس کے چہرے پر ایک نئی تازگی ابھر آئی۔ وہ خود بھی سطوت مرزا کو پسند نہیں کرتی تھی۔ بالے پیچھے والی کار میں بچوں کے ساتھ شور و غل مچاتا چل رہا تھا۔ اگلی کار شوکت ڈرائیو کر رہا تھا اور پچھلی خود بالے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

ہلچل

خلدآباد پولیس ہیڈ کوارٹرز کی عمارت کے دوسرے منزلے پر پولیس افسروں کی ایک بند دروازے کی میٹنگ ہو رہی تھی اور باہر دو سنتری اٹینشن کھڑے تھے، جنھوں نے اخباری رپورٹوں کو باہر ہی روک رکھا تھا۔ نیوز ٹائمز اور مارننگ نیوز کا دراز قد رپورٹر لانگ فیلو بھی ان میں شامل تھا۔

"صاحب، آپ لوگ چلے جایئے، ورنہ مفت میں ہمیں ڈانٹیں پڑیں گی۔" سنتریوں میں سے ایک نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"میرے بھائی، ہم بغیر رپورٹ لیے چلے جائیں گے تو ہمیں بھی اپنے اپنے اڈیٹروں کی ڈانٹیں پڑینگی۔" رپورٹروں میں سے ایک نے نرمی سے سمجھایا، لیکن اسی وقت زینے پر اپنے بھاری بوٹوں کی چاپ سے شور کرتا ہوا ایک سب انسپکٹر بھی اوپر آپہنچا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ لوگ شاید پریس رپورٹرز ہیں؟" اس نے لہجے میں کافی نزاکت پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک خیال ہے آپ کا، قبلہ۔" لانگ فیلو بول اٹھا۔

"لیکن یہ میٹنگ صیغۂ رازکی ہے۔ میرا مطلب ہے کانفیڈنشل۔" سب انسپکٹر نے جتایا۔

"اسی لیے تو ہم باہر انتظار کر رہے ہیں کہ دیکھیں مداری کے پٹارے سے کیا نکلتا ہے۔" دوسرے جرنلسٹ نے جواب دیا۔

"اوہ، تو پھر انتظار کیجیے۔ بھئی، انھیں انتظار کرنے دو، کوئی حرج نہیں ہے۔" اس نے سنتریوں کی طرف گھوم کر کہا اور پھر لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا برآمدے میں کچھ آگے جا کر ایک

دروازے میں داخل ہوگیا۔

"بھئی، یہ معاملہ کیا ہے؟ میں تو الٹے پ چلا آیا ہوں۔ دفتر میں کہا گیا کہ راجمار اندر سنگھ کی بیٹی کی گمشدگی کی تفصیلات معلوم کرو۔ مگر مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ آخر واقعہ کب اور کہاں ہوا؟" رپورٹروں میں سے ایک نے بے تکلفی سے لانگ فیلو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"آپ جرنلسٹ ہیں یا گھسیارے؟ آپ کو بسنت کی بھی خبر نہیں۔" لانگ فیلو نے منہ بنا کر اسے جھڑکتے ہوئے جواب دیا۔

"اصل بات یہ ہے، یار، کہ میں کل سے ڈیوٹی پر ہی نہیں آیا تھا۔ ایک خاص پروگرام میں چلا گیا تھا۔" وہ سچ سچ بتانے لگا۔

"لیکن دفتر میں حاضری لگی ہوگی، یہی نا؟" لانگ فیلو نے کہا۔

"ہُم..." اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"تو سنو، راجمار اندر سنگھ کی ولایت پلٹ کماری مس شوبھا کل اپنے چند دوستوں اور دوستیوں..." لانگ فیلو بتانے لگا۔

"دوستیوں...؟" رپورٹر نے اسے ٹوکا۔

"ارے بھائی، دوستوں کا مونث اور کیا ہوگا۔ خیر تم سہیلیوں سمجھ لو۔ بہر حال ان سب کے ساتھ وہ کل پکنک کے ایک لمبے پروگرام پر گئی تھیں، جہاں بھوتیا جھیل میں موٹر بوٹ دوڑاتی ہوئی وہ بیچ جھیل میں اس طرح غرق ہوگئیں کہ پھر واپس نہیں نکلیں۔" لانگ فیلو نے بتایا۔

"کیا وہ اکیلی تھیں؟" رپورٹر نے اپنی ڈائری میں نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"یار سین، تم بھی نرے چغد ہو، ابھی ابھی بتا چکا ہوں کہ سہیلیاں اور سہیلے بھی ساتھ تھے۔"

Akram Allahabadi

”لیکن مقابلہ دو کشتیوں کا تھا، ایک میں صرف چار لڑکیاں سوار تھیں اور دوسری میں صرف مرد یا لڑکے، جو کچھ بھی کہہ ڈالو۔“

”تو پھر کیسے غرق ہو گئیں وہ؟“

”کماری کا دل رکھنے کے لیے یا بالفاظِ دیگر انھیں پولسن لگانے کے لیے مردوں نے اپنی موٹر بوٹ کافی پیچھے رکھی اور کماری صاحبہ جیت کے جنون میں بوٹ کو اور تیز دوڑاتی ہوئی جب بیچ میں پہنچیں تو اچانک پانی میں بھنور پیدا ہو گیا اور وہ مع کشتی اور سہیلیوں کے اس میں ڈوب گئیں۔ وہ بھی ایسی کہ نہ کشتی کا پتا ہے نہ ان کا۔“

”اور انھیں تلاش بھی نہیں کیا گیا؟“ سین نے بھولے پن سے پوچھا۔

”وہ بھی کسی کمہار کے گدھے کی گمشدگی تھی کیا؟ مہاراجہ کے رشتے دار کی بیٹی ہے، بیٹے۔ پولیس کا ناطقہ بند ہو گیا ہے کل سے۔ یہ بند کمرے کی کانفرنسیں اسی کے لیے ہیں سب۔“ لانگ فیلو نے جیب سے ادھ جلی کیپسٹن سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔ ”یار، آدھی سگریٹیں نہ پیا کرو، نقصان دیتی ہیں۔“ سین اسے سمجھانے لگا۔

”کام کی بات کر، بھائی، کام کی، یہ میرا پرسنل معاملہ ہے۔“ لانگ فیلو نے ایک لمبا سا کش لے کر کہا۔

”تو پھر تلاش میں کشتی تو مل ہی گئی ہو گی۔ ہو سکتا ہے ڈوب ہی گئی ہوں وہ لڑکیاں۔“ سین نے اظہارِ خیال کیا۔

”تم واقعی الو ہو۔ پولیس کو وہ کشتی ندی کنارے ایک جھاڑی میں چھپی ہوئی ملی ہے۔“

”تو گوریلے اٹھا لے گئے ہوں گے۔“

”او اخروٹ کے بچے، یہ ہندوستان ہے، افریقہ نہیں ہے۔“

”تو پھر ڈاکو۔“

"وہ الگ بات ہے، مگر پولیس وہاں کا چپہ چپہ چھان چکی ہے، مگر کوئی سراغ نہیں ملا ابھی تک۔" لانگ فیلو نے بتایا۔

"تو بس پھر اپنی رپورٹ تو ہوگئی اب، اپن تو چلے۔" وہ اپنی نوٹ بک جیب میں رکھتے ہوئے اپنی نجی زبان میں بولا۔

"ٹھہرو، میرے برخوردار رپورٹر، تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ ہوسکتا ہے کہ اس کے مرد ساتھیوں نے ہی سازش کر کے انھیں اغوا کر دیا ہو اور اس طرح فرضی رپورٹ دے دی ہو۔ آخر ایسا بھی تو ہوسکتا ہے۔"

لانگ فیلو نے پھر بات چھیڑ دی۔

"چل بھئی چل، مجھے مت بنا۔ ان کے بیوی بچے بھی تو ہوں گے اس کشتی میں۔"

"بچے...؟ یہ کہاں سے پیدا کر لیے تو نے؟" لانگ فیلو نے بے تکلفی سے اس کی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

"خیر بچے گھر پر ہی چھوڑ آئی ہوں گی، مگر بیویاں تو ہوں گی؟" اس نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تھوڑی سی عقل آگئی ہے تم میں۔"

"مجھے تو خبر بنانے کے لیے صرف ہنٹس (اشارے) چاہئیں بس۔ آپ کل کے اخبار میں یہ خبر..." سین یہ کہہ کر کھسکنے لگا۔

"جو آج کے اخباروں میں آچکی ہے۔" لانگ فیلو ہنس کر بولا۔

"ارے تو پھر۔ گویا مجھے بے وقوف بنایا گیا۔" وہ جھنجلا کر ٹھہر گیا اور سب ہنس پڑے۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد پولیس افسروں کی کانفرنس ختم ہوگئی۔ اور جب یکے بعد دیگرے باہر نکلنے لگے تو رپورٹر صرف ان کی صورتیں دیکھتے ہی رہ گئے۔ چونکہ ان کے چہرے خود کا نفڈنشل بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی پریس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ

وہ جانتے تھے کہ پریس والے پولیس سے بھی باتوں باتوں میں سب کچھ اگلوا لیتے ہیں۔
اخبارات کے فوٹو گرافرز نے البتہ انسپکٹر جنرل وغیرہ کے فوٹو لے لیے۔ رپورٹروں کو مایوس لوٹنا پڑا اور اب وہ اپنی رپورٹوں میں صرف اندازے پیش کر سکتے تھے۔

لان گ فیلو بھی اس محنت کے رائگاں جانے کے بعد کچھ اتنا بور ہو گیا تھا کہ اپنے دفتر جانے کی بجائے وہ سیدھا دربار ہوٹل جا پہنچا۔ شام کے اوقات میں اکثر وہ یہاں تھوڑی بہت دیر کے لیے آیا کرتا تھا۔ ایک جرنلسٹ ہوتے ہوئے اس کے مراسم شہر کے معزز سے معزز آدمی اور بڑے سے بڑے سرکاری افسروں سے تھے۔ وہ ہر ایک سے بے لوث ملتا۔ اس نے ان کی بڑائی کی کبھی پرواہ نہیں کی تھی اور اسی وجہ سے وہ لوگ بھی اسے اور اس کی صاف گوئی پسند کرتے تھے۔

نواب خرم سے اس کی دوستی تھی۔ حالانکہ ان کی دوستی بے جوڑی معلوم ہوتی ہے۔ نواب خرم خاندانی رئیس اور عمر میں پچپن ساٹھ کے لگ بھگ تھے اور لانگ فیلو ۳۰ سال کی عمر کا شتر مرغ۔ مگر دونوں زندہ دل اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ اس لیے خوب نبٹتی تھی۔ وہ دربار ہوٹل میں ان کی وجہ سے ہی آیا کرتا تھا۔ نواب خرم ساڑھے ۹ بجے تک اپنی کار میں یہاں آ پہنچتے اور دس گیارہ بجے تک جینٹس ریٹائرنگ روم میں بیٹھے یا تو تاش وغیرہ کھیلتے رہتے یا گپیں لڑایا کرتے۔ کچھ کاروباری خوش فکرے بھی ان اوقات میں اپنی بیویوں سمیت آ جاتے تھے۔ یہ ہوٹل جو شہر کے اعلا معیار کے ہوٹلوں میں اول نمبر کا تھا، ان کے لیے مستقل تفریح گاہ بن چکا تھا۔ آج وہ خلافِ معمول نواب خرم سے پہلے ہی دربار ہوٹل پہنچ گیا۔ ہوٹل کے بیرونی نشستیں اس وقت بالعموم پر رہا کرتی تھیں، مگر نواب خرم اگر نہ آئے ہوتے تو وہ باہر ہی بیٹھ جاتا۔ آج بھی اسے باہر کی ایک نشست پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرتے ایک گھنٹے سے زیادہ گزر گیا۔ ساڑھے ۹ بجے کے بعد ان کا آنا زیادہ ممکن نہ تھا۔ شاید وہ کسی کام میں الجھ گئے ہوں۔

اور کچھ یونہی بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہیں گرم سوٹ والے موٹے سے آدمی پر جم گئیں جو

Akram Allahabadi

دیر سے ایک میز کے پاس بیٹھا ہاتھ میں شاید کسی کی تصویر سے اسے گھور رہا تھا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے دوسرے آدمی سے، جو کلین شیو اور اور قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا، آہستہ لہجے میں کچھ گفتگو کرتا جاتا۔ ان کی یہ گفتگو دیر تک چلتی رہی۔ دوسرا آدمی کبھی کبھی پلٹ کر ایک نظر چاروں طرف دوڑا رہا تھا۔ اور خواہ مخواہ لانگ فیلو کو اس کی اس حرکت سے ایک دلچسپی سی ہوئی۔ وہ اسی پر نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ نواب خرم آئیں گے تو خود ہی بلوا لیں گے۔ یہ سوچ کر اسے اطمینان تھا۔

'چلو آج سراغ رسانی کریں۔ ضرور یہ لوگ کسی دھندے کی بات چیت کر رہے ہیں۔ یا پھر شاید کسی رشتے کی ہو۔' وہ اپنی ڈائری نکال کر اسے یہ جملے خود اپنے ہی سے خطاب کرتے ہوئے لکھ کر اس نے ڈائری جیب میں رکھ لی اور کافی کا آرڈر دے دیا۔ پھر وہ اکتائے ہوئے انداز میں آپ ہی آپ گنگنانے لگا۔ جیسے کوئی فلمی گیت ہو۔

'تم نہ آؤ گے نواب خرم... ہے ہے... تم نہ آؤ گے... بھیا تم نہ آؤ گے... اور نہیں آتے جو جاؤ نہ آؤ۔ اپن کو چلے گی... چلے گی ایک کافی۔ کافی ہے بس کافی ہے۔' وہ اسی طرح اپنے اپینک ورشن کے الٹے سیدھے بے سر پیر کے گیت گنگناتا رہا، جیسے کوئی بے سرہ گاتا ہے۔

ان لوگوں نے شاید یہ محسوس بھی نہیں کیا تھا کہ وہ انھیں گھور رہا ہے، یا ان کی طرف متوجہ ہے۔ وہ اپنی گفتگو ختم کرنے کے بعد ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بل شاید وہ بیرے کو وہیں ادا کر چکے تھے، لیکن خلاف توقع وہ ہوٹل کے ہال کے پچھلے چھوٹے دروازے سے باہر نکلے۔ لانگ فیلو سیٹ پر سے اٹھا ہی تھا کہ پیچھے سے بیرا پلیٹ میں بل لیے آ پہنچا۔ "صاحب۔" اس نے اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرائی۔

"اوہ... ہاں... مگر یار کیا برے وقت ٹپکے ہو۔" وہ جیب سے ایک روپیہ نکال کر پلیٹ میں رکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

"صاحب، چھٹے پیسے ابھی لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کاؤنٹر کی طرف چل دیا، لیکن

Akram Allahabadi

لانگ فیلو باقی پیسوں کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی جیبیں اس انداز سے ٹٹولتا ہوا، جیسے کچھ بھول گیا ہو، ہال کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اسے ڈر تھا کہ اتنی دیر میں وہ لوگ نکل گئے ہوں گے، لیکن وہ کمبخت بیرا پھر سے آ پہنچا۔

"صاحب، پیسے تو لیجیے باقی کے۔" اس نے پیچھے سے آواز دی۔

"جہنم میں جائیں تمہارے پیسے۔" اس نے بیرے کو جھڑک دیا اور بیرا اسے عجیب سی نظروں سے گھورنے لگا۔ "اب جاؤ نا، میرے سر پر کیا کھڑے ہو۔" وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ اور بیرا سٹپٹا کر پیچھے ہٹ گیا۔

لانگ فیلو ابھی پچھلے دروازے کی بیرونی سیڑھیاں اتر ہی رہا تھا کہ زناٹی ہوئی ایک برق رفتار اسٹیشن ویگن کار جو حلیے سے کافی پرانی معلوم ہوتی تھی، اس کے سامنے سے گزر گئی۔ لانگ فیلو یہ دیکھ کر چونک پڑا کہ اس میں وہی دونوں آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں کسی ٹیکسی کے فوراً آجانے کی دعا کرنے لگا۔ اور شاید اس کی دعا سن بھی لی گئی، کیونکہ اسی وقت ایک ٹیکسی دوسری طرف سے آ پہنچی۔

"اے بھائی صاحب، ذرا ایک منٹ۔" لانگ فیلو نے ہاتھ کا اشارہ کر کے آواز دی۔ اور ڈرائیور نے ٹیکسی روک لی۔

"کیا منگتا ہے تم کو؟" ڈرائیور نے سر باہر نکال کر پوچھا۔

"گاڑی خالی ہے نا؟"

"صاحب، ابھی تو بہت روشنی ہے تم کو گاڑی اس میں بھی کھالی نظر نہیں آتا۔" وہ مسخرے پن سے بولا۔

"عجیب آدمی ہو تم، یار۔" وہ یہ کہتے ہوئے دروازہ کھول پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"آگے ابھی ایک پرانی سی اسٹیشن ویگن گئی ہے۔"

"تو اس کو پکڑنے کا ہے؟"

Akram Allahabadi

''نہیں،صرف پیچھا کرو۔''

''پیسے تگڑے ہوں گے۔''ڈرائیور نے کہا۔

''لو،یہ دس ایڈوانس۔''لانگ فیلو نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔

''چل بھئی طوفان میل۔''ڈرائیور نے ایکسیلیٹر پر پیر رکھا اور ٹیکسی رینگتے رینگتے ہوا سے باتیں کرنے لگی۔وہ کار ابھی بمشکل ایک چوڑی سڑک ہی طے کر پائی تھی کہ ایک دوسری تپلی سڑک کے موڑ پر ٹیکسی نے اسے جالیا۔

''گاڑی اتنی پیچھے رکھو کہ وہ لوگ چونک نہ پائیں۔''لانگ فیلو نے کہا۔

''میں نے بھی گھاس نہیں کھودی ہے، صاحب۔سب سمجھتا ہوں۔''ڈرائیور اسے اطمینان دلاتے ہوئے بولا۔اور واقعی وہ زگ زیگ کے ذریعے بڑے مزے سے ان کا تعاقب کر رہا تھا۔آگے جانے والی کار کو ذرا بھی شبہ نہ ہوا، ورنہ اس کی رفتار تیز ہو گئی ہوتی۔

بالآخر وہ گاڑی ایک تنگ و تاریک گلی کو عبور کر کے ایک دوسری چوڑی سڑک پر نکل آئی، جہاں مدھم سرکاری روشنی بس اتنی تھی کہ عمارتوں کی کھڑکیاں گنی جا سکیں۔لانگ فیلو نے اپنی گاڑی سڑک کے موڑ پر ہی رکوالی، جب اس نے اس کار کو کوئی دو سو قدم آگے ایک پختہ عمارت کے سامنے فٹ پاتھ سے لگ کر رکتے دیکھا۔یہ سڑک بالکل سونی تھی اس وقت اور ادھر دفاتر کی عمارتوں کے سوا کوئی آبادی بھی نہ تھی۔اس سہ منزلہ عمارت کے داخلی دروازے پر اندر کی طرف ایک بلب لگا ہوا تھا، جس کی مدھم سی روشنی اندر کی طرف رہنمائی کرتی تھی۔لانگ فیلو ٹیکسی ڈرائیور کو رخصت کر کے پیدل آگے چلنے لگا۔فٹ پاتھ پر عمارتوں کی دیواروں کے سہارے اندھیرے میں بڑھتا ہوا اس عمارت کے دروازے تک پہنچ گیا، جہاں وہ دونوں کار سے اترے تھے۔اس نے بلب کی مدھم روشنی میں دیکھا، بلڈنگ کا کوئی نام نہیں تھا، صرف چوکھٹ پر ایک چھوٹی سی پلیٹ لگی ہوئی تھی جس پر کچھ باریک نمبر کھدے ہوئے تھے۔اس کی جیب میں ٹارچ تھی، لیکن اس نے اسے جلانا مناسب نہ سمجھا۔البتہ چاروں طرف دیکھ کر موقع و

Akram Allahabadi

مقام کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تا کہ وہ دن کی روشنی میں بھی اس عمارت کو پہچان سکے۔ پھر وہ یہ دیکھ کر کہ سڑک بالکل سونی ہے، تیزی سے اس کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ زیریں راستے کو چھوڑ کر ایک چوڑا زینہ نصف دائرے کی شکل میں گھومتا ہوا اوپر گیا تھا۔ پچھلے دروازے پر سن گن لینے کے بعد اندازے کے مطابق وہ اوپر چڑھنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں اس عمارت میں داخل ہونے کے وجوہ کے لیے ایک طریق کار بنا لیا تھا۔ چنانچہ سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی اس کے پیر لڑکھڑانے لگے اور کیفیت شرابیوں جیسی ہو گئی۔

پہلی منزل پر پہنچ کر اس نے چھجے کے ساتھ کمروں کی ایک قطار اور ان کے دروازے دیکھے جو بند تھے۔ وہ یہاں بھی تقریباً ایک منٹ اندھیرے میں ساکت کھڑا رہا، لیکن کوئی خفیف سی آہٹ بھی نہ ہوئی۔

پھر وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا دوسری منزل پر جا پہنچا۔ یا تو شاید یہ عمارت بالکل خالی تھی یا پھر اس کے رہنے والے سرِ شام ہی سو جانے کے عادی تھے۔ بہر حال فوری طور پر وہ یہی قیاس کر سکا کہ عمارت خالی ہے۔ اور ویسے بھی عمارت کی بناوٹ یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کسی ایک ہی لمبے چوڑے خاندان کی رہائش کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

یہاں پہنچ کر ایک عجیب سا خیال اس کے ذہن میں رینگنے لگا۔ کہیں وہ لوگ اسے خوبصورتی سے دھوکا تو نہیں دے گئے۔ عمارت میں تو بظاہر کوئی ذی روح نہیں معلوم ہو رہا تھا اور سوائے داخلی دروازے کے باقی تمام دروازے بند تھے۔ زینے پر البتہ کیونکہ دروازے نہیں تھے، اس لیے تیسری منزل تک بآسانی پہنچا جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ناکام واپس لوٹنے کے لیے قدم بڑھاتا، پھر ایک بار وہ سوچ میں پڑ گیا کہ یہاں تک آنے کے بعد تیسری منزل بھی کیوں نہ دیکھ لی جائے۔ تیسری منزل کی شکل بالکل مختلف تھی۔ یہاں زینہ ختم ہو کر ایک دو طرفہ چاندنی سے مل گیا تھا، جس پر دونوں طرف بڑے بڑے دو کمرے فلیٹ روف والے تھے اور ان کی کھڑکیاں، دروازے سب بند تھے۔ وہ پھر چکر میں پڑ گیا۔ اور شاید اب کی بار وہ مایوس ہو کر

Akram Allahabadi

لوٹ پڑتا، مگر اسی وقت اس کی نظر شمال کی طرف والے کمرے کی ایک کھڑکی کے صرف ایک شیشے پر جم گئی۔ وہ اندر سے روشن نظر آ رہا تھا۔ لانگ فیلو کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ کیا یہ بات پراسرار نہیں تھی کہ ایک اتنی بڑی خالی عمارت کی اوپری منزل کے صرف ایک کمرے کی ایک کھڑکی کا ایک شیشہ ہی روشن نظر آئے؟

وہ بلی جیسی چال سے دبے قدم چلتا ہوا اس کھڑکی کے نزدیک پہنچ گیا۔ جیب سے رومال نکال کر شیشے کو منہ کے بھپارے سے ذرا گھسنے سے اس کا ایک کونہ صاف ہو گیا اور وہ اندر کی چیزیں دیکھ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ چونک پڑا، کیونکہ اس کمرے میں جہاں ایک بڑی میز کے گرد اس وقت تین آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک بہت خوبصورت سی نوجوان لڑکی بھی سہمی سہمی سی بیٹھی تھی۔ اور وہ آدمی، جس کا رویہ ان تینوں میں تحکمانہ معلوم ہوتا تھا، کھڑکی کی طرف پیٹھ کیے ہوئے تھا۔ البتہ سامنے کی طرف بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں میں ایک مضبوط جسم والا سیاہ فام آدمی تھا، جس نے شریف آدمیوں کی طرح گرم سوٹ پہن رکھا تھا اور دوسرا ایک اوباش قسم کا بگڑی شکل کا آدمی معلوم ہوتا تھا، جس نے اس وقت زیادہ سردی نہ ہوتے ہوئے بھی موٹا اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ اپنے چہرے کے نچلے حصے کو کوٹ کے کالروں میں چھپائے ہوئے تھا۔ لانگ فیلو نے شیشے کے سرے پر لگی ہوئی پوٹین کو ماچس کی تیلی سے اکھاڑ کر اپنا ایک کان اس پر چپکا دیا۔ اسے اندر کی آوازیں بالکل صاف تو نہ سہی، پھر بھی سنائی دینے لگیں۔ وہ آدمی جس کی پیٹھ کھڑکی کی طرف تھی، کہہ رہا تھا۔

”اسے پوری حفاظت اور احتیاط سے کلکتہ پہنچانا ہے۔ میں بھی سنیچر تک پہنچ جاؤں گا۔“ اس کا تخاطب سوٹ والے آدمی سے تھا۔ ”اور تم۔“ وہ اوورکوٹ والے سے مخاطب ہوا۔ ”تمہاری ذمے داری یہ ہے کہ بورے بغیر چیکنگ کے گاڑی میں سوار ہو کر روانہ ہو جائیں۔“

”بالکل ایسا ہی ہوگا، باس۔“ اس آدمی نے یقین دلایا۔

”رقم لائے ہو؟“ اس باس نما آدمی نے سوٹ والے سے پوچھا۔

Akram Allahabadi

"پچاس ہزار ہیں۔"

"مگر سات بورے ہیں۔"

"باقی کلکتہ پہنچنے پر، لیکن مجھے پورے ہونے چاہئیں۔" وہ بولا۔

"کمی کا سوال نہیں جب بورے پورے ہیں۔"

اس پر سوٹ والے نے جیب سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں۔ وہ تقریباً ۲۰-۱۵ گڈیاں تھیں۔ باس نے ان میں سے ایک گڈی اس اوورکوٹ والے کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"تم اور تمہارے آدمی۔"

"کم ہیں، باس۔ رسک زیادہ ہے۔" اوورکوٹ والا بولا۔

"آئندہ کوئی بکواس نہ سنوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک گڈی اور اس کی طرف پھینک دی۔ "مال اڈے سے لے لو۔"

وہ لڑکی حیرت وخوف سے ان کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔

"گھبراؤ نہیں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی، اگر تم سیدھی رہیں، لیکن اگر تم نے کوئی ایسی حرکت کی جس سے دوسروں کو شبہ ہوا تو پھر اسی وقت اپنی جان سے جاؤ گی۔ ویسے کلکتہ میں تمہیں ایک اچھی زندگی ہی ملے گی۔" ان کے باس نے بھاری آواز میں لڑکی سے کہا۔

اور وہ اور زیادہ چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی وہ۔

کچھ دیر بعد وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تم چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر یہاں سے نکل جاؤ، ورنہ پھر ہم ذمے دار نہ ہوں گے۔" اس نے گرم سوٹ والے کو ہدایت کی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ پھر ان میں سے ایک نے لڑکی کا بازو تھام لیا اور وہ ایک محبوس پرندے کی طرح صرف پھڑ پھڑاتی رہ گئی۔ وہ تینوں اسے لے کر کمرے کے پچھلے

Akram Allahabadi

دروازے سے نکل گئے۔ روشنی گل ہوگئی اور ایک بھیانک سناٹا چھا گیا، جس میں کسی کے قدموں کی چاپ تک نہ سنائی دے سکی۔ لانگ فیلو حیران تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ بورے مال، لڑکی، پچاس ہزار۔ اور اگر یہ کوئی تجارتی سودا تھا تو اس قدر چھپ کر اور اتنی رات گئے کیوں۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نہ جانے کون سی بھاری سی چیز اس کے سر پر پیچھے سے اس زور سے پڑی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے چمک اٹھے اور وہ تیوراکر وہیں گر پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

رازداری

پولیس کے صدر دفاتر سے علاحدہ خلد آباد سٹی پولیس ہیڈ کوارٹرز پتھر کی ایک لمبی چوڑی مضبوط اور پرانی عمارت میں واقع تھے اور اس کا داخلی دروازہ کسی شاہی محل یا قلعے کے دروازے کی طرح اونچا اور محراب دار تھا۔ جس وقت نواب مقدر جنگ کی خوبصورت لمبی کار اس میں داخل ہوئی تو دروازے کا سنتری اور ادھر ادھر ٹہلنے والے عملے کے دوسرے لوگ بھی چونک پڑے۔ نواب صاحب کی کار پہچانی ہوئی تھی، کیونکہ مقدر جنگ بہرصورت ایک مشہور اور معزز شخصیت رکھتے تھے۔ مگر کار سے ان کی بجائے دو اجنبی ہی اترے جنھیں وہ لوگ پہنچاننے کی کوشش کرتے رہ گئے۔

"ممکن ہے ہمیں یہاں کافی وقت لگے۔ تم جب تک کہیں جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔" خان نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔

"بہت اچھا، صاحب۔ صرف چائے پینے جاؤں گا۔" وہ مؤدب لہجے میں بولا۔ خان آگے بڑھ گیا۔

"تم ہماری طرف سے کیک پیسٹری بھی کھا سکتے ہو۔" بالے نے اسے مزید اجازت دے دی۔ اور وہ مسکرا کر رہ گیا۔ بالے اس کا مطلب سمجھ گیا اور جیب سے دو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی گود میں پھینکتے ہوئے بولا۔

"بڑی حلال کی کمائی ہے، خوب کھا کر اوپر سے سوڈا پی لینا۔" بالے نے آہستہ سے کہا۔

"بہت اچھا، صاحب۔" ڈرائیور اسے سلام کرتے ہوئے خوشی کے موڈ میں بولا۔ پھر بالے بھی اجنبیوں کی طرح اس عمارت کے فرش سے چھت تک کا جائزہ لیتا ہوا خان کے

پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔

"فرمایے۔" ایک چشمہ بر عین بوڑھے سے محرر نے داہنی طرف کے میز سے انھیں ٹوکا۔ خان تو مسکرا کر آگے بڑھ گیا، مگر بالے اس سے الجھ گیا۔

"میرا ایک ۳۵ سالہ گدھا کہیں کھو گیا ہے، ذرا فال تو نکالیے کس طرف گیا ہے؟" بالے محرر سے بولا۔

"معاف کیجیے گا پولیس گدھوں کی تلاش کے لیے نہیں ہے۔" محرر نے بوڑھی خوش اخلاقی کے ساتھ جواب دیا، لیکن اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"اوہ، آپ قطعی غلط سمجھے۔ دراصل وہ میرا بھتیجا ہے اور سر سے پیر تک گدھا ہوا ہے، اسی لیے عرض کر رہا ہوں۔" بالے نے جملے کا مطلب ہی بدل ڈالا۔

"کیا نام ہے اس کا؟" محرر قلم سنبھالنے لگا۔

"اس کا نام کچھ اچھا ہی سا ہے... آہاں یاد آیا، حرام مونچھ۔"

"آپ مذاق فرما رہے ہیں۔" محرر نے چشمے کی کمانی نیچے کھسکا کر اسے گھورا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ آپ جیسی بزرگ شخصیت سے اور مذاق۔ لعنت ہے ایسا سوچنے والے پر۔" بالے نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ لیکن کچھ دور بیٹھا ہوا ایک سب انسپکٹر اور دو ہیڈ کانسٹیبل جو اس کے ان عجیب سے مکالموں سے دلچسپی لینے لگے تھے، قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"دیکھیے دیکھیے، یہ آپ کو بھڑکا رہے ہیں اور مفت میں مجھے حوالات میں بند کرا دیں گے۔ حالانکہ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ خلافِ شریعت حرام قسم کی بڑی بڑی مونچھیں رکھتا ہے۔" بالے نے لہجے میں اور معصومیت پیدا کر لی۔

"مسٹر..." محرر اپنی جگہ سے اسے گھورتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

مگر ٹھیک اسی وقت اوپر سے اترتا ہوا ایک پولیس کانسٹیبل آ پہنچا۔

"بالے صاحب۔"

Akram Allahabadi

"کون صاحب ہیں؟"

اس نے سامنے سے آتے ہی پوچھا۔

"جی فرمایے، میں ہی بالے واقع ہوا ہوں۔" بالے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اور اس کا نام سن کر مع محرر کے سب چونک پڑے۔ اس نام سے ان کے کان آشنا تھے۔ انھوں نے بارہا بمبئی پولیس کی رپورٹوں اور اخبارات میں بمبئی کے ممتاز ترین سراغ رساں سپرنٹنڈنٹ خان کے ساتھ اس نام کو پڑھا تھا۔

محرر تو قلم دانتوں میں دبائے رہ گیا۔

"آپ کو خان صاحب یاد فرما رہے ہیں۔" سپاہی نے اٹینشن رہتے ہوئے کہا۔ اور اب تو تمام لوگوں کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ محرر بیچارہ سٹپٹایا۔

"یہ یاد فرمانا بھی ایک عجیب مرض ہوتا ہے، واللہ۔ اچھا، منشی جی، ٹاٹا۔" وہ بوڑھے محرر کی طرف گھوم کر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ اور منشی جی نے بغیر ہنسی کے بھی بتیسی نکال دی۔ دوسرے دیکھتے ہی رہ گئے اور بالے اس سپاہی کے پیچھے پیچھے اوپر چلا گیا۔

اوپر ایک چوڑے آراستہ کمرے میں جس کے دروازے پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر ایل جی ٹھاکر کا بورڈ لگا تھا، جب بالے داخل ہوا تو خان ایک تنومند سانولے رنگ کے داڑھی مونچھوں سے بے نیاز باوردی پولیس افسر کے سامنے کرسی پر بے تکلفی سے نیم دراز گفتگو کر رہا تھا۔

"لیجیے، یہ ہے وہ نارومی۔" خان نے بالے کو دیکھتے ہی اس کی طرف اشارہ کرکے ایس پی ٹھاکر سے کہا۔ بالے بڑی سنجیدگی اور ادب سے اسے سلام کرتا ہوا قریب آ گیا۔ ایس پی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"شکل سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ بھئی، واقعی مجھے آپ کے ساتھ انھیں بھی دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔" انھوں نے بالے کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خان سے کہا۔

Akram Allahabadi

"کہنے کو عمران کی ۲۳۔۲۴ تک پہنچ گئی ہے، مگر لڑکپن اب بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔" خان نے مزید تعارف کرایا۔

"قبلہ، یہ غلط بیانی ہے، میں ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوا تھا۔"

"ہاں۔ یہ ایک دلچسپ لطیفہ ہے۔ ان کی پولیس میں شمولیت کے وقت غلطی سے ایک کلرک نے ان کی تاریخِ پیدائش کے خانے میں ۱۹۲۲ء کی جگہ ۱۹۴۲ء لکھ دیا تھا۔" خان نے بتایا۔

"اوہ۔" ایس پی ہنس پڑا۔

ایس پی ٹھاکر آفس میں چائے پینے کے عادی نہ تھے، لیکن خان کو چائے پینے پر مجبور کر کے انھوں نے پولیس کینٹین سے اسی وقت چائے منگوالی اور بے موقع دور چلنے لگا۔

"میں آپ سے ملاقات کرنے کے علاوہ اس بھوتیا جھیل کے بارے میں بھی کچھ جاننا چاہتا تھا جس میں اچانک گرداب پیدا ہو کر آدمیوں کو غائب کر دیتا ہے۔" خان نے چائے ختم کر کے سلسلۂ گفتگو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، یہ عجیب مخمصہ ہے جو آج تک میری بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ حتیٰ کہ ہمارا ایک پولیس آفیسر بھی اس بلا کی نذر ہو گیا۔" ایس پی نے سنجیدگی اور تعجب کے لہجے میں کہا۔

"کیا وہ تحقیقات کے لیے گیا تھا وہاں؟"

"اصل مقصد تو تحقیق کرنا ہی تھا۔"

"تو کسی کی کمر میں زنجیر یا رسی باندھ کر کیوں نہ کوشش کی گئی؟" خان نے پوچھا۔

"یہ طریقہ بھی ہم آزما چکے ہیں ایک بار، لیکن جب ایسا ہوتا ہے تو گرداب بھی نہیں پیدا ہوتا۔" ایس پی نے بتایا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟" خان نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔

"میں تو بھوت پریت کا قائل نہیں، پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا، اور سچ پوچھیے کبھی کبھی تو

سوچنے لگتا ہوں کہ اگر واقعی بھوت پریت کوئی چیز نہیں تو صدیوں سے ان کے تذکرے کیسے چلے آتے ہیں، بے وجہ تو کوئی بات پیدا نہیں ہوا کرتی۔'' ایس پی ڈھل مل یقین ہو کر کہنے لگا۔

''بات تو واقعی مبہم سی ہے، لیکن بہر صورت میں چاہتا ہوں کہ مجھے انسپکٹر کی غرقابی والے کیس کی تفصیلات مل جائیں۔ مثلاً کب گیا، کیسے گیا، کیا وقت تھا وغیرہ وغیرہ۔'' خان نے فرمائش کی۔

''ہاں ہاں، ضرور، بلکہ ابھی لیجیے۔'' یہ کہہ کر ایس پی ٹھاکر نے میز کی گھنٹی بجائی۔

اردلی فوراً اندر آ پہنچا۔

''سب انسپکٹر سعید کو بلاؤ۔'' اس نے حکم دیا۔

اور اردلی اسی وقت ایڑیاں بجا کر چلا گیا۔ وہ تقریباً جب پانچ منٹ بعد واپس لوٹا تو اس کے ساتھ اکہرے بدن کا ایک جوان سا انسپکٹر تھا، جو دروازے میں داخل ہوتے ہی ایڑیاں بجا کر اٹینشن ہو گیا۔

''سب انسپکٹر سندرے اور بھوتیا جھیل کے کیسز کے متعلق جس قدر تفصیلات آپ کو درہوں، ریکارڈ روم سے فراہم کر دیجیے۔'' ایس پی نے خان کی طرف اشارہ کر کے اسے حکم دیا۔

''بہت بہتر۔''

''آپ چلیے، میں وہیں آتا ہوں۔'' خان نے خود اس سب انسپکٹر کو اشارہ کیا۔ اور وہ ایس پی کو سلام کر کے چلا گیا۔

''بہتر ہوگا اگر کسی کو نہ معلوم ہو کہ میں آپ سے ملا تھا، یا یہاں ہوں۔ بلکہ حکام بالا کو بھی نہیں۔'' خان نے ایس پی ٹھاکر سے دوسری فرمائش کی۔

''اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔'' ایس پی نے وعدہ کیا۔

اس کے بعد خان اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا اور رہا لے ایک سعادت مند اسسٹنٹ کی

طرح سنجیدہ بنا ہوا باہر نکل آئے۔

"لیکن، قبلہ، نیچے والوں کو اگر معلوم نہیں ہوا تو شک ضرور ہو گیا ہے کہ ہم کون ہیں۔" بالے نے کہا۔

"ہونے دو، ہمیں بہر صورت خاموشی سے کام لینا چاہیے۔" خان یہ کہتا ہوا ایک اردلی کے پیچھے، جو انھیں ریکارڈ روم کا راستہ دکھا رہا تھا، ہو لیا۔

☆☆☆☆☆☆

خان ابھی ابھی خلد آباد سٹی پولیس ہیڈ کوارٹرز سے بھوتیا جھیل میں پولیس انسپکٹر سنڈے کے بھی غرق ہونے کی تفصیل معلوم کر کے لوٹا ہی تھا کہ نواب صاحب نے ایک نئی شخصیت سے اس کا تعارف کرایا۔

"بھئی، ان سے ملو، کب سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔" نواب صاحب سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے بولے۔ خان لباس تبدیل کیے بغیر ہی وہیں بید کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ میرے بہت گہرے دوست ہیں، کنور رنجیت سنگھ، اور یہ ہیں میرے بھتیجے بھی اور دوست بھی، ہندوستان کے مشہور اور بمبئی کے ممتاز ترین سراغ رساں آفیسر سپرنٹنڈنٹ حضور احمد خان۔" نواب صاحب نے دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرا دیا۔ خان نے مسکراتے ہوئے کنور صاحب سے مصافحہ کیا۔

لیکن کنور کے مصافحے میں گرم جوشی کے باوجود ان کے لبوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔

"کیوں کیا بات ہے، آپ کچھ بیمار ہیں؟" خان پوچھ ہی بیٹھا۔

"بھئی، بڑی عجیب ٹریجڈی ہو گئی ہے اس کے ساتھ۔ ان کی لڑکی کماری شوبھا ابھی ابھی ولایت سے لوٹ کر آئی تھی اور اپنی اس روشن خیالی کے زعم میں وہ پکنک منانے گئی تو بھوتیا

جھیل پر۔ اسے بھی وہی حادثہ پیش آیا جو ہم لوگ اس دن دیکھ چکے تھے۔" نواب مقدر جنگ نے خود ہی ان کی اداسی کا سبب سمجھا دیا۔

"اور یہ میرے ایسے دوست ہیں جیسے تمہارے ابا حضور تھے، اسی لیے ان کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" نواب صاحب نے سفارش کی۔

"ضرور کروں گا۔" خان بولا۔ "کنور صاحب، یقین رکھیے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا۔" خان نے کہا۔

"یہ دیکھو یہ تصویر بھی ہے اس کی۔ کتنی اچھی تھی میری منہ بولی بیٹی۔" نواب صاحب کنور کے ہاتھ سے ایک تصویر لے کر خان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ خان اسے غور سے دیکھنے لگا۔

"کنور صاحب، خدا نے چاہا تو میں آپ کی بیٹی کو واپس لاؤں گا۔" خان نے وعدہ کیا۔

"بھوتوں سے؟" نواب صاحب نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جب وہ بھوت آپ کے سامنے آئیں گے تو آپ اور زیادہ حیران ہو جائیں گے۔" خان نے مسکرا کر کہا۔

"کیوں، کیا پکڑا کسی کو؟" نواب صاحب نے پوچھا۔

"جائیں گے کہاں، آج نہ سہی کل سہی۔" خان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"آپ کا بڑا احسان ہوگا، خان صاحب، مجھ پر۔" کنور صاحب ممنونیت سے لرزتی آواز میں بولے۔

"ایسی کوئی بات نہیں، کنور صاحب۔ جیسی وہ آپ کی بیٹی، ویسی میری بیٹی۔ آپ صبر و ہمت سے کام لیجیے۔ میں اسے ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔" خان نے پھر ایک بار انھیں یقین دلایا۔

Akram Allahabadi

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بالے نواب صاحب کے دونوں کتوں سے باتیں کرتا ہوا اندر آ گیا۔

"بالے۔"

"یس، سر۔" وہ بغیر سلام کے اٹینشن ہو گیا۔

"بمبئی سے اسرار اور ابراہیم کو فوراً یہاں بلا لو، مگر تار رضوان احمدی ہوٹل کے پتے پر بھیجنا۔ لکھنا اتفاقی رخصت لے کر آ جائیں۔" خان نے سنجیدگی سے اسے ہدایت کی۔

"اگر آپ حکم دیں تو میں خود ہی تار سے جا کر انھیں لے آؤں۔" بالے نے اسے مؤدب طریقے سے جواب دیا۔

"یہ دیکھیے، کسی وقت اس کی کل سیدھی رہتی ہی نہیں۔" خان نواب صاحب سے شکایت کرنے لگا۔

"کل تو نہیں، مائی باس، پرسوں ضرور سیدھی ہو جائے گی اپنی۔" یہ کہہ کر قبل اس کے کہ خان کچھ اور کہے، کتوں کو چمکارتا ہوا باہر نکل گیا اور نواب صاحب، کنور صاحب اور خان ہنستے رہ گئے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

روح کا فون

پولیس افسران کو تو بھوتیا جھیل کے آسیبی انسانوں پر سرے سے یقین ہی نہیں تھا۔
پولیس ہیڈ کوارٹرز میں آج حوالات کے کسی کمرے میں جگہ نہ تھی۔ کل کی چیکنگ کے بعد رات کو اچانک پولیس نے ایک راؤنڈ اپ میں شہر کے تمام مشتبہ جرائم پیشہ افراد کو گرفتار کر لیا تھا اور علاحدہ علاحدہ ان سے آج باز پرس کی جا رہی تھی۔ تمام تر کوشش کماری شوبھا اور اس کی ساتھی لڑکیوں کی گمشدگی کے بارے میں تھی۔ انویسٹی گیشن تھیٹر میں ایک بڑے سے چوکھٹے میں کماری شوبھا اور ساتھی گمشدہ لڑکیوں کے کارڈ سائز تصویریں لگی ہوئی تھیں اور مختلف قسم کے افراد سے انھیں دکھا دکھا کر طرح طرح کے سوالات کیے جا رہے تھے۔ پولیس شہر کے تمام عیاشی کے اڈوں اور مشتبہ مقامات پر چھاپے مار چکی تھی، لیکن کماری تو دور، کسی ایک لڑکی کا بھی پتا نہ چل سکا تھا۔ اس لیے اب بعض چھٹے ہوئے بدمعاشوں پر لاک اپ میں تھرڈ ڈگری کا طریقہ آزمایا جا رہا تھا، لیکن وہ بھی سودمند ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ خلد آباد ڈی آئی جی پولیس خود اس وقت اوپر دفتر میں موجود تھے۔ کنور بخت سنگھ کی کوٹھی سے اور گمشدہ لڑکیوں کے رشتے داروں کی طرف سے ٹیلی فون سنتے سنتے ان پر جھنجلاہٹ سوار ہو گئی۔

اب کی بار تو انھوں نے طے کر لیا تھا کہ فون آیا تو کہہ دیں گے کہ ہم نہیں ہیں، لیکن ابھی یہ سوچ کر بیٹھے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی اور انھیں طوعاً کرہاً ریسیور اٹھانا ہی پڑا۔

"ہیلو۔" انھوں نے آواز کو اور بگاڑ کر کہا۔

"جی دیکھیے، آپ ڈی آئی جی صاحب ہیں نا؟" ادھر سے آواز آئی۔

"اور نہیں تو کیا ان کا چپراسی ہوں۔" جھنجلاہٹ میں وہ کہہ گئے۔

"اوہو، آپ تو اس وقت کافی جھنجلائے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں، بہر حال میں

ایک شریف آدمی آپ کو فون کر رہا ہوں۔"

"آپ شریف اور کمین کا فلسفہ رہنے دیجیے۔ فرمایے، کیوں تکلیف دی ہے آپ نے؟"

"میں صرف یہ مشورہ دینا چاہتا تھا کہ کم از کم اگلے ۲۰۔۲۴ گھنٹوں کے لیے آپ ریلوے اسٹیشن اور مضافاتی سڑکوں کے ناکوں پر پولیس کا سخت مگر خفیہ پہرہ لگا دیجیے، کیونکہ کوئی بھی ایک لڑکی ان میں سے کسی راستے اغوا کی جا رہی ہے اور غالباً یہ خوبصورت لڑکی کماری شوبھا کی ساتھی لڑکیوں میں سے ایک ہے۔" ادھر سے دھیمے لہجے میں جواب ملا۔

"جی...؟ کیا فرمایا آپ نے؟" ڈی آئی جی چونک پڑے۔

"میں صحیح عرض کر رہا ہوں۔ کل رات اسی شہر میں ایک جگہ چند زندگیاں ایک گراں قدر رقم کے عوض بیچی گئی ہیں اور نہ جانے اس سے پہلے اور کتنے سودے ہو چکے ہوں گے۔ ساتھ ہی اس شخص، یعنی خریدار، یا اس کے ایجنٹ کو چوبیس گھنٹوں میں اس شہر کو مع ایک لڑکی کے چھوڑ دینے کی ہدایت کر دی گئی ہے۔ یہ ایک کالے رنگ اور دوہرے بدن کا ایک موٹا سا آدمی ہے، جس کی شکل بہت کچھ بلڈاگ سے ملتی ہے۔ آپ کے قابو میں آ گیا تو گمشدگی کے تمام سنسنی خیز وارداتوں کا سراغ آپ کو مل جائے گا۔" ادھر سے جواب ملا۔

"یہ سب آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ آپ کون صاحب ہیں؟" ڈی آئی جی نے اس سے تقریباً مشکور انداز میں سوال کیا۔

"یہ جاننا زیادہ ضروری بھی تو نہیں اور پھر اس کا نہ جاننا ہی بہتر ہے۔ مجھے بہر حال اپنا دوست یا مددگار ہی سمجھیے۔" ادھر سے جواب ملا۔

"پھر بھی، آپ بتا دیں گے تو ہمارے لیے یقین کرنے میں زیادہ آسانی ہو گی۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"یقین نہ کریں گے تو خود پچھتائیں گے آپ۔ ویسے میں ایک سپرنٹنڈنٹ کی

روح ہوں۔''

''روح ؟ یہ کیا مذاق ہے؟'' ڈی آئی جی چونک پڑے۔

''مانیں یا نہ مانیں، یہ آپ کا کام ہے، میں تو جو ہوں وہ بتا دیا۔'' فون میں اس نامعلوم مددگار کا جواب ملا۔

''تو یعنی کہ آپ واقعی، مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ ضرور اپنی شخصیت چھپا رہے ہیں۔'' ڈی آئی جی نے فون پر اپنا سر نفی میں جھٹکتے ہوئے کہا۔

''میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں، روح کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ میں آپ کی مدد کرنے آیا ہوں۔'' فون پر وہی پراسرار آواز سنائی دی۔

''اچھا، یونہی ہی سہی۔'' ڈی آئی جی نے مایوس لہجے میں کہا اور پھر دوسری طرف سے کنکشن کٹ گیا۔ ڈی آئی جی اس پراسرار اطلاع پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہوئے اسی وقت تمام گزرگاہوں اور ریلوے اسٹیشن پر فوراً پولیس کی تعیناتی کے احکامات جاری کر دیے اور اس کے چند منٹ بعد ہی ان پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

کہاں آنکھ کھلی

"پولیس، پولیس..." لانگ فیلو آنکھیں کھولتے ہی چیخنے لگا، لیکن پھر یہ محسوس کر کے کہ وہ ایک آراستہ کمرے میں ایک بستر پر اکیلا پڑا ہے، اس کی آواز حلق میں اٹک گئی اور وہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور وہ یہاں کیسے آ گیا۔ اسے سینما کے پردے پر متحرک منظر کی طرح رات کے واقعات یاد آنے لگے۔ اس وقت سویرا ہو چلا تھا اور کمرے کی شرقی کھڑکیوں سے اجالا اندر جھانک رہا تھا۔ شاید اس کی آواز باہر سن لی گئی تھی۔ دو منٹ بعد ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک کھچڑی بالوں والا آدمی، جس نے سفید تر کی کوٹ اور سفید پتلون پہن رکھی تھی، اندر آ گیا۔ بشرے سے وہ عجیب قسم کا آدمی معلوم پڑتا تھا۔ جیسے ہنس بھی رہا ہو اور سنجیدہ بھی۔ وہ اوسط قد و قامت کا آدمی تھا۔ اندر آتے ہی اس نے گھور کر لانگ فیلو کو دیکھا اور پھر کسی بچے کے انداز میں ہمک کر بول اٹھا۔

"فریادی، تم نے ہمیں پکارا تھا؟"

"آ... آپ... آپ کو..." لانگ فیلو خشک گلے میں باسی تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "میں نے تو پولیس کو آواز دی تھی۔"

"ہم جنت کی پولیس کے ہیڈ کوارٹر ہیں۔" وہ قطعی سنجیدگی سے بولا۔

"جنت کی پولیس؟ ہیڈ کوارٹر؟" لانگ فیلو کے منہ سے حیرت سے نکلا۔

"ہاں، کیا دیکھتے نہیں تم، مگر ہاں تم تو مادی دنیا سے ابھی نئے نئے مر کر آئے ہو۔ ابھی تو تمہیں لٹ پٹا سا لگتا ہوگا۔" اس نے لانگ فیلو کے اور قریب آ کر کہا۔

"مر کر آئے ہو۔" لونگ فیلو نے دگنی حیرت سے دہرایا، کیونکہ کھچڑی بالوں والے اس شخص کے لہجے میں قابلِ یقین سادگی بھی تھی۔

"ہاں، کل تمہاری دنیا میں تمہیں کسی نے قتل کر دیا تھا۔"

"قتل...؟" وہ اچھل پڑا۔

"ہاں، تمہارا کٹا ہوا سر ہمیں دریائے ٹیمز کے کنارے اور دھڑ دریائے نربدا کے کنارے ملا تھا۔"

"یہ آپ کیا بک رہے ہیں؟"

"بک نہیں رہے، ہم فرما رہے ہیں۔ جنت کے پولیس ہیڈ کوارٹرز سے اس طرح گفتگو نہیں کی جاتی۔ تم نے تمیز سے دوستی کی ہے کبھی؟"

"تمیز سے دوستی؟ یا خدا، آخر آپ ہیں کون؟ یہ ہے کونسی جگہ؟"

"یہ جنت کا جنرل اسپتال ہے اور ہمارا نام پنچ پوکلی ہے۔"

"اف..." لانگ فیلو نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ سارا کمرہ اس ادھیڑ عمر کے آدمی کے قہقہوں سے گونج اٹھا۔

"وہ مارا... وہ مارا..." وہ چیخا۔ اور پھر اس کے قہقہے اور لمبے ہوتے گئے۔ لانگ فیلو کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا مصیبت ہے۔

"کیا ہے، چچا جان؟ آپ یہاں بھی آ پہنچے۔" اچانک دروازے کی طرف سے ایک کھنکتی آواز سنائی دی۔ لونگ فیلو چونک پڑا۔ وہ بوٹے سے قد کی ایک نوجوان ماہ پیکر لڑکی تھی، جسے وہ سرسری نظر سے دیکھ کر پھر سے دیکھنے میں مجبور ہو گیا، ورنہ جہاں مردوں کی ہر سوسائٹی میں وہ بلا جھجک پہنچ جاتا وہیں عورتوں کے معاملے میں وہ بڑا جھینپو واقع ہوا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اکثر لڑکیاں اسے بدھو سمجھتی تھیں۔ وہ کسی بھی عورت سے، خواہ وہ اس کی قریبی رشتے دار ہی کیوں نہ ہو، گفتگو کرتے ہوئے شرمائے بغیر نہ رہتا۔ اور کبھی کسی اجنبی لڑکی سے اگر اس کا سامنا ہو جاتا تو وہ بوکھلا سا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی اس نے کسی لڑکی سے اتنی بے جھجک نظریں نہ ملائی تھیں، سوائے آج کے۔ اور وہ بھی اس سوچ میں کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ وہ غیر ارادی طور

Akram Allahabadi

پر اسے کچھ دیر تک تکتا رہ گیا تھا۔

''تو..تو یہ آپ کے چچا جان ہیں؟''اس نے اٹکتے اٹکتے لڑکی سے پوچھا۔

''جی ہاں۔''اس نے ادھیڑ عمر آدمی کو ایک ایک بازو سے تھامتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر...؟''لانگ فیلو نے کہنا چاہا۔

''مگر نہیں، مگر مچھ بولو۔بیٹی دیکھا، یہ ہمیں مگر مچھ بولتا ہے۔تم فوراً ہماری توپ اٹھا لاؤ، ہم اسے دوبارہ ہلاک کر کے اس کی دنیا میں پہنچا دیں گے۔''

''چچا جان۔''لڑکی نے ملتجیانہ انداز میں اسے واپس چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ناممکن۔اس نے ہمیں چچا جان کیوں تسلیم نہیں کیا۔یہ امریکہ کی طرح ضدی معلوم ہوتا ہے اور ہم چین کی طرح اڑے رہیں گے۔''وہ وہیں دھرنا دے کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

اف...بھئی، آپ ہی تسلیم کر لیجیے نا۔''اس نے لانگ فیلو کی طرف رخ کر کے یہ کہتے ہوئے اشارے سے بتایا کہ موصوف خلل دماغ کے شکار ہیں۔

''تو یہ بات ہے۔''لانگ فیلو مسکرایا۔''قبلہ، اپنا تو اپنا، میں آپ کو اپنے باپ کا بھی چچا جان تسلیم کیے لیتا ہوں۔''وہ ادھیڑ عمر آدمی کی طرف سنجیدگی سے رخ کر کے بولا۔

''اہنم...اولاد سعادت مند معلوم ہوتی ہے۔اچھا جاؤ معاف کیا اور ہاں، بیٹی، اسی بات پر اسے دو بکرے، سیر بھر مکھن اور دو چار من روٹیاں ناشتے میں بھجوا دو، ہم جاتے ہیں۔''یہ کہہ کر وہ کسی جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گئے اور لانگ فیلو نے لمبی ٹھنڈی سانس لی۔

''ذرا سنیے۔''وہ لڑکی کو بھی جاتے دیکھ کر ٹوکتے ہوئے بولا۔

''جی۔''وہ رک گئی۔

''کم از کم یہ تو بتا دیجیے کہ میں یہاں کب اور کیسے آیا؟ آپ لوگ کون ہیں؟''

''یہ آپ کو ابا حضور ہی بتائیں گے، وہی آپ کو رات کو یہاں لائے تھے اپنی گاڑی

Akram Allahabadi

میں۔" لڑکی نے بتایا۔

"ابا حضور...وہ کہاں ہیں؟ کون ہیں؟"

"وہ شاید غسل خانے میں گئے ہیں، آتے ہی ہوں گے۔ اور ہاں، کیا آپ بیڈ ٹی کے عادی ہیں؟" اس نے جاتے جاتے رک کر پوچھا۔

"جی، میں صرف گڈ ٹی کا عادی ہوں۔ ویسے اگر سو کر اٹھتے ہی مل جائے تو نعمت سمجھتا ہوں۔"

"مل جائے گی۔" یہ کہتی ہوئی وہ مسکرا کر باہر نکل گئی اور لانگ فیلو جیسے سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ چھت کی طرف اٹھ گئے۔

"یا خدا، مل جائے گی تو یہی مل جائے بغیر جنت کی حور۔" وہ صبح کی پہلی دعا کے ساتھ بولا۔

"کیا خواب دیکھ کر اٹھے ہو؟" اچانک نواب خرم اندر داخل ہوتے ہوئے بھاری آواز میں بولے۔

"جی...اوہ، آپ۔" وہ چونک پڑا۔ "میں نے حور مانگی تھی، مل گئے آپ۔" وہ بستر سے اٹھ کر پاس پڑی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تم رات کو ہمیں ایک سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے ملے تھے، کیا بہت پی گئے تھے؟" نواب خرم نے پوچھا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ حرام ہے، صاحب، حرام ہے۔ میرے ساتھ تو دراصل کچھ عجیب ڈرامائی واقعات پیش آئے تھے، بلکہ میرا تو سر بھی..." یہ کہتے کہتے اسے جیسے سر پر لگنے والی ضرب یاد آ گئی اور وہ اپنا سر ٹٹولنے لگا، مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ مار کا نشان نہ کوئی زخم، البتہ سر میں ٹٹولنے سے پیچھے کی طرف خفیف سا درد ضرور محسوس ہوا۔ اس نے رات کا سارا قصہ انھیں سنا ڈالا۔

Akram Allahabadi

"بھئی، عجیب واردات ہے یہ بھی، جیسے واقعی کوئی ڈرامہ ہو۔" نواب خرم نے کہا۔

"مگر تم نے پولیس میں اس کی رپورٹ دی؟"

"آپ بھی واللہ کمال کرتے ہیں۔تب کی بیہوشی سے تو اب ہوش میں آیا ہوں اور پھر میری سمجھ میں اب تک نہیں آرہا ہے کہ آیا وہ آدمی تھا کون۔"

"وہ کوئی بھی ہو، مگر پولیس سے مل کر دیکھ لو۔" نواب خرم نے رائے دی۔"اور میں چاہتا ہوں کہ پولیس جلد از جلد کم از کم اس بلڈنگ پر چھاپا مار کر اس کی تلاشی لے لے۔تمہارے خیال کے مطابق تو اسے بردہ فروشی کا واقعہ ہونا چاہیے، لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ سودا کسی اور بارے میں ہو؟" نواب خرم نے کہا۔

"میں کوئی سراغ رساں نہیں ہوں، جناب، جو اندازوں پر تیر چلاؤں۔میں نے جو کچھ دیکھا، وہ بتا دیا۔" لانگ فیلو نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"اچھا ان میں سے کسی کا حلیہ یاد ہے؟" نواب خرم نے پوچھا۔

"حلیہ...؟ اجی سب ہی کے تو حلیے بگڑے ہوئے تھے، دیکھتا کیا خاک۔" وہ بولا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

محاصرہ

ابھی دن کے ۱۰ ہی بجے تھے اور دھوپ میں ہلکی تمازت آچکی تھی کہ اچانک آرادھیہ کا انشورنس بلڈنگ کے دروازے پر یکے بعد دیگرے پولیس کی تین گاڑیاں آکر رکیں، جن میں سے اگلی گاڑی سے سب سے پہلے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس، ہمت سنگھ اور لانگ فیلو اترے۔

"آپ کو ٹھیک سے یاد ہے کہ وہ عمارت یہی ہے؟" سپرنٹنڈنٹ نے لانگ فیلو سے دریافت کیا۔

"سو فیصدی یہی ہے، صاحب، لیکن اس وقت تو یہاں خاصی چہل پہل ہے، رات کو تو قطعی سناٹا تھا۔" لانگ فیلو نے کہا۔

"ارے، مگر یہ تو انشورنس کمپنی کے دفاتر ہیں، یہاں کیا دھرا ہے۔ تم ضرور بھول رہے ہو۔" سپرنٹنڈنٹ نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں قطعی صحیح کہہ رہا ہوں، جناب۔"

"تم نے ہم سب کا وقت برباد کیا، مسٹر۔ کیا خواب دیکھا تھا کل رات کو؟" سپرنٹنڈنٹ کے لہجے میں اب بھی بیزاری تھی۔

"آپ خدا کے لیے ذرا چھان بین تو کیجیے۔" لانگ فیلو اپنی بات پر اڑا رہا۔ "ممکن ہے یہ سب باہر سے دکھاوا ہو۔"

"لوگ اسے حماقت سے زیادہ حیثیت نہ دیں گے۔ بہر حال۔" یہ کہہ کر وہ اپنے اسسٹنٹ، انسپکٹر بال چندر کی طرف گھوما۔ "آپ باہر سے بلڈنگ کو گھیر لیجیے اور ایک آدمی اندر بھیج کر معلوم کیجیے کہ آیا واقعی یہ باقاعدہ دفاتر ہیں یا کچھ اور۔" اس نے حکم دیا۔

"بہتر ہے، حضور۔" اس نے اٹینشن ہو کر جواب دیا۔

Akram Allahabadi

اور ذرا ہی دیر میں پولیس نے اس عمارت کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ راہ سے گزرنے والے لوگ پولیس کی موجودگی پر حیران ہو کر کھڑے ہو جاتے، پولیس انھیں ٹھہرنے نہ دیتی۔ مقامی سی آئی ڈی کا ایک سفید پوش آدمی اب اندر چلا گیا۔

"اس دربان کو بلاؤ۔" ایس پی نے اپنی کار میں بیٹھے ہوئے ایک سب انسپکٹر کو حکم دیا۔ اس نے فوراً ہی ایک حوالدار کو اشارہ کر دیا۔ دربان حوالدار کا اشارہ پاتے ہی دوڑ کر آ پہنچا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"برج بھان، حضور۔"

"کب سے یہاں کام کرتے ہو؟"

"حضور، دو سال سے۔"

"کب سے کب تک ڈیوٹی دیتے ہو؟"

"صبح آٹھ بجے سے شام کو ۶ بجے تک۔"

"رات کا دربان یا چوکیدار کون ہے؟"

"دو آدمی ہیں، حضور۔"

"رات کو بھی یہاں کوئی کام ہوتا ہے؟"

"بالکل نہیں۔ ساڑھے ۵ بجے شام کو سب دفتر بند ہو جاتے ہیں اور ۶ بجے میں رات ڈیوٹی والے کو پوری بلڈنگ چیک کرا کے جاتا ہوں۔"

"ہُم... کل تم کس وقت گئے تھے؟"

"حضور، ۶ بجے۔"

"دوسرے چوکیدار کہاں رہتے ہیں؟"

"اسی بلڈنگ کے پیچھے کوارٹرز میں۔"

"انھیں بلا کر لاؤ، مگر ہماراؤ کرمت کرنا۔" سپرنٹنڈنٹ نے ہدایت کی۔

Akram Allahabadi

"بہت خوب۔" یہ کہہ کر دربان اسی وقت عمارت کے پیچھے کی سمت چلا گیا۔ اندر گیا ہوا سادہ لباس سی آئی ڈی کا آدمی پندرہ منٹ کے بعد لوٹ کر آیا اور اتفاق سے اس وقفے میں نہ کوئی نیا آدمی اس عمارت کے اندر داخل ہوا نہ اندر سے نکلا۔

"صاحب، اندر پہلے اور دوسرے مالے پر دفتر ہیں، جن میں کلرک لوگ بیٹھ کر کام کر رہے ہیں۔"

"اور تیسرا مالا؟"

"وہ خالی ہے یا پھر اس کے دفتر بند ہیں۔"

"تم اندر کس حیثیت سے گئے تھے؟"

"نوکری ڈھونڈنے۔"

"دفتروں کی حیثیت کیا ہے؟"

"کافی پرانی۔ چند الماریاں اور کرسیاں۔ میزیں بھی پرانی ہیں۔"

"اور اسٹاف؟"

"کچھ شریف صورت معلوم ہوتے ہیں اور بعض کے حلیے ٹیڑھے ہیں۔"

"منیجر کون ہے؟"

"منیجر کوئی عیسائی ہے جس کا نام لوبو ہے اور منیجنگ ڈائرکٹر نواب خرم ہیں۔" اس نے بتایا۔ جس پر سپرنٹنڈنٹ کے پاس بیٹھا ہوا لانگ فیلو اچھل پڑا۔

"نواب خرام، ناممکن۔" وہ بولا۔

"آپ نرے احمق ہیں۔ کیا ان کا منیجنگ ڈائرکٹر ہونا کوئی جرم ہے؟" ایس پی نے کہا۔

"میرا مطلب ہے رات والی بات، یعنی وہی مجھے اٹھا کر لے گئے تھے۔" لانگ فیلو بولا۔

Akram Allahabadi

''ان دونوں چوکیداروں کو یہاں لاؤ۔'' سپرنٹنڈنٹ نے برج بھان کے ساتھ آنے والے دونوں چوکیداروں کو دور سے دیکھ کر کہا۔ چنانچہ ان دونوں کو کار کے پاس لے آیا گیا۔

''کیا نام ہیں تمہارے؟'' سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔

''رام اوتار۔''

''شیو رام۔'' دونوں نے یکے بعد دیگرے کہا۔

''رات تم لوگ یہاں ڈیوٹی پر تھے؟''

''جی، صاحب۔''

''سامنے والے دروازے پر کون تھا؟''

''میں تھا، صاحب، مگر میں اس طرف گشت لگاتا ہوں، دروازے پر بیٹھتا نہیں ہوں۔''

''یہ میں نے کب پوچھا تھا۔'' ایس پی نے آنکھیں مچکا کر عجیب سے لہجے میں کہا۔ جس پر چوکیدار ٹپٹا سا گیا۔

''ان دونوں کو پولیس اسٹیشن لے چلیے۔'' ایس پی، انسپکٹر سے بولا۔ اور ساتھ ہی اس نے اپنی کار اسٹارٹ کر دی۔

''ارے مگر...'' لانگ فیلو نے کہنا چاہا۔

''اب اپنی اگر مگر رہنے دیجیے آپ۔'' ایس پی نے اس کی بات کاٹ دی۔

پولیس ایس پی کے پیچھے ہی واپس چلی گئی۔ انسپکٹر نے دونوں چوکیداروں کو اپنی کار میں بٹھا لیا تھا اور دن والے چوکیدار کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ان کے بارے میں کسی کو ابھی کچھ نہ بتائے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

پھر وہی فون

"ایس پی ہمت سنگھ ابھی اپنے دفتر میں داخل ہوا ہی تھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو۔" اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"میں ایک سپر نٹنڈنٹ کی روح ہوں۔"

"اوہ... فرمایے ...روح صاحب۔" ایس پی نے مذاق اڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

"اگر آپ کو اس عمارت پر کوئی شبہ بھی تھا تو کیا اس طرح دن دھاڑے اور سر عام پولیس لے جا کر آپ نے کسی عقلمندی کا ثبوت دیا ہے؟" آواز آئی۔

"کیا مطلب؟" ایس پی بگڑ گیا۔

"اگر وہ کسی کے مجرموں کی پناہ گاہ ہے تو اس طرح وہ اور ہوشیار ہو گئے ہوں گے۔ آپ یہ کام صرف سی آئی ڈی سے لے سکتے تھے۔" ادھر سے آواز آئی۔

"مگر آپ ہیں کون نصیحت فرمانے والے؟"

"میں نے کہا نا کہ میں ایک پولیس سپر نٹنڈنٹ کی روح ہوں۔"

"ہشت ..." ایس پی بولا۔ "روح بھلا ٹیلی فون کیسے کرے گی؟" اس نے بچوں جیسی معصومیت سے منہ بنا کر کہا۔

"یہ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا، لیکن اب آپ ان دونوں چوکیداروں کو بے گناہ قرار دے کر چھوڑ دیجیے اور اس عمارت پر رات کے وقت سی ئی ڈی کے عملے سے کڑی نگرانی کرایے۔

Akram Allahabadi

"بہت خوب، جناب نامعلوم۔"

"نواب خرم کو بھی ابھی بالکل نہ چھیڑیے، ورنہ اگر کچھ کام بنتا بھی ہوگا تو بگڑ جائے گا۔"

"اور کچھ؟" ایس پی جھنجلا گیا۔

"جو کچھ کہا ہے وہ آپ کی بہتری کے لیے ہے، ورنہ پچھتایے گا۔"

"اچھا بابا، بس۔ میں ایسا ہی کر کے دیکھ لیتا ہوں۔" ایس پی نے گویا ہتھیار ڈال دیے اور دوسری طرف سے فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆

دوپہر کا وقت ہو گیا تھا اور ابھی تک نہ تو کسی ناکے سے، ریلوے اسٹیشن، یا کسی اور مقام سے کسی مشتبہ لڑکی یا اس کے اغوا کی کسی واردات کی اطلاع آئی تھی اور اس طرح سپرنٹنڈنٹ پولیس کی روح کا پراسرار پیغام بظاہر ایک دلچسپ مذاق معلوم ہو رہا تھا۔ خود ڈی آئی جی پولیس اس پر کسی قدر یقین کر لینے کی اپنی حماقت پر آپ شرمسار نظر آ رہے تھے، لیکن پھر بھی یہ کماری شوبھا اور اس کی ساتھی گمشدہ لڑکیوں کی تلاش میں پولیس کی سرگرمی کے ایک اور مظاہرے کی شکل میں اتنا بور نہیں ہو رہا تھا۔

گمشدگی کے واقعات تو ویسے متعدد ہو چکے تھے، جن میں مرد بھی غائب تھے اور عورتیں بھی۔ بڑی دیر سے ڈی آئی جی اپنے کمرے میں اکیلے ہی دروازے سے کھڑکی اور کھڑکی سے دروازے تک ٹہل رہے تھے کہ اچانک ان کا اردلی چق اٹھا کر اندر آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید لفافہ تھا۔

"صاحب، یہ چٹھی ایک کالا سا آدمی دے گیا ہے۔" وہ بولا۔

"ڈی آئی جی نے لفافہ لے لیا اور پھر اسے چاک کر کے دیکھنے لگے۔ اسے پڑھتے

پڑھے ان کے چہرے کی کیفیت کئی بار بدلی اور پھر انھوں نے اسے میز پر رکھ لیا۔یہ ایک خط تھا جس میں لکھا تھا:

ڈی۔آئی۔جی۔صاحب!

آپ کی محنت رائگاں نہیں گئی۔باوردی پولیس کی تعیناتی سے وہ لوگ چوکنے ہو گئے۔بہر حال اس وقت آپ گڈس شیڈ میں لائے جانے والے سامان اور مسافروں کے ایسے اسباب چیک کرائے جن میں پورا ایک انسان سما سکتا ہو۔شہر کے باہر جانے والی سڑکوں کے ناکوں پر بھی اسی طرح ہر گاڑی اور سامان کی چیکنگ ہونی چاہیے۔یہی موقع ہے۔

فقط آپ کا خیر خواہ

ایک سپرنٹنڈنٹ کی روح

ضرور کوئی مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ڈی آئی جی نے بڑبڑاتے ہوئے اس خط کو تو ڑ مروڑ کر جیب میں رکھ لیا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر آفس سے نکل کر کار میں بیٹھ کر چل دیے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

لانگ فیلو

"سرکار، کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔" نواب مقدر کے نوکر شیخ کالو نے سامنے آکر ادب سے کہا۔

خان اس وقت کھانے سے فارغ ہو کر اخبار پڑھ رہا تھا اور بالے نواب صاحب کے بچوں کے ساتھ بغیچے میں کرکٹ کھیل رہا تھا۔

"مجھ سے؟" خان نے چونک کر پوچھا۔ "کون صاحب ہیں؟"

"ہیں ایک لمبے سے اونٹ کے اونٹ۔" شیخ کالو نے بتایا۔

"خیر آنے دو۔" وہ یہ کہہ کر پھر اخبار دیکھنے لگے۔

شیخ کالو کے جاتے ہی پردہ پھر ہلا اور واقعی ایک قبول صورت، مگر اونٹ کی سی قامت والے آدمی نے اندر جھانکا۔

"آ سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، تشریف رکھیے۔" خان نے اخبار ایک طرف رکھ کر اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور وہ بیٹھ گیا۔

"آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے یا نواب صاحب سے؟" خان نے پوچھا۔

"جی نہیں، صرف آپ سے۔" وہ بولا۔ اور خان کسی قدر چونک سا پڑا۔

"اچھا تو فرمایے۔"

"لوگ مجھے لانگ فیلو کہتے ہیں اور میں ٹائمز کا مقامی نامہ نگار ہوں۔" وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔" خان نے مصافحہ کیا۔ "لیکن مجھ سے کیا کام

ہوسکتا ہے آپ کو؟" اس نے پوچھا۔

"میں نے رات کو ایک خواب دیکھا تھا کہ ہندوستان کے ایک مشہور سراغ رساں افسر سپرنٹنڈنٹ حضور احمد خاں یہاں آئے ہوئے ہیں اور نواب صاحب کے یہاں ٹھہرے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"بڑا خطرناک خواب تھا آپ کا، لیکن کہاں دیکھا تھا یہ آپ نے؟" خان نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"سچ سچ بتادوں تو سٹی پولیس ہیڈ کوارٹرز میں۔" وہ ہنس کر بولا۔

"اوہ، تو آپ کی روح بھی موجود تھی وہاں۔" خان بھی ہنسا۔ "خیر، تو پھر...؟" اس نے سوال کیا۔

"آپ یقین مانیں یا نہ مانیں، لیکن مجھے آپ سے ملنے کا عرصے سے اشتیاق تھا۔ یہاں کے تمام پولیس افسر مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اور میرے دوست ہیں یا سمجھیے میں ان کا دوست ہوں، لیکن معلوم نہیں آپ مجھ پر اتنا اعتماد کریں گے یا نہیں۔" وہ بلا جھجک گفتگو کرنے لگا۔

"میں ہر جرنلسٹ پر اعتماد کرتا ہوں، بشرطیکہ وہ اپنی بے موقع رپورٹوں سے میرا کام نہ بگاڑے۔" خان نے سگریٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

"رات کو کچھ ایسے حالات گزرے ہیں کہ مجھے ان پر کسی بڑی سازش کا شبہ ہے، لیکن یہاں کی پولیس بس ماشاءاللہ ہے، ہر چیز کو کھیل سمجھتی ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "اور اسی لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ شاید آپ ان کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں۔" لانگ فیلو نے کہا۔

"آپ شاید رادھیکا انشورنس والے واقعے کا ذکر کر رہے ہیں؟" خان کے اس جواب نے اسے چونکا دیا۔

"تو کیا... آپ کو معلوم ہے...؟ واللہ، آپ آدمی ہیں یا جن۔" وہ حیرت کا اظہار کیے

Akram Allahabadi

بغیر نہ رہ سکا۔

"عقلمند آدمی، تمہارا ٹیکسی ڈرائیور میرا اسسٹنٹ بالے تھا۔" خان نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔

"اچھا... تب ہی وہ ایسی اینٹھی اینٹھی باتیں کر رہا تھا۔" لانگ فیلو نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ خان اس کا مطلب سمجھ گیا۔

"وہ اس وقت سینگیں کٹا کر بچھڑا بنا ہوا بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا ہے۔" خان نے بتایا۔

"خیر، ان سے پھر مل لوں گا، مگر آپ کا کیا خیال ہے اس سلسلے میں؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارا خیال ٹھیک ہے۔" خان نے جرنلسٹوں سے بے تکلف ہو جانے والی اپنی عادت کے مطابق لاپرواہی سے کہا۔ "لیکن حالات ذرا مختلف ہیں۔ بہرحال میری ایک بات مانو تو اچھا ہوگا۔" وہ ناصحانہ انداز میں بولا۔

"فرمایئے، ضرور مانوں گا، بلکہ میری تو تمنا ہے کہ آپ ہی کے ساتھ رہ کر کچھ سیکھوں، کچھ کروں۔" وہ کہنے لگا۔

"خیر اس کا بھی وقت آ سکتا ہے، لیکن اس معاملے میں اب قطعی رازداری برتو اور خاص کر میرے یہاں موجود ہونے کا علم کسی کو نہ ہونا چاہیے۔ میں غیر سرکاری طور پر اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہوں اور ہو سکتا ہے اس سے معاملہ کچھ بگڑ جائے۔" خان نے اسے ہدایت کی۔ "بلکہ اگر پولیس کے نچلے عملے میں کسی کو شک بھی ہو ہمارے یہاں ہونے کا، تو کسی طرح اسے جھٹلا دو۔" وہ بولا۔

"آپ کی ہدایت کی پوری پوری تعمیل ہوگی۔" لانگ فیلو اٹھتے ہوئے بولا۔

"بیٹھو، چائے پی کر جانا۔" خان نے اصرار کیا۔

''کم از کم چائے سے انکار کرنا میں اخلاقیات کے منافی سمجھتا ہوں۔'' یہ کہتا ہوا وہ اب کی بار صوفے پر جم گیا۔

تھوڑی دیر میں چائے آ گئی۔نواب صاحب کی ہدایت تھی کہ بغیر پوچھے ہر آنے والے مہمان کے لیے چائے تیار کر کے پہنچا دی جایا کرے۔ لانگ فیلو نواب صاحب کے ڈرائنگ روم کو اپنا گھر سمجھ کر صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

ٹرین روک لی

ابھی نمبر ۲۴ اپ ایکسپریس کے آنے میں نصف گھنٹے کی دیر تھی کہ پلیٹ فارم کے داخلی دروازے پر ایک لینڈو باڈی شیورلیٹ کار آ کر رک گئی۔ اس میں سے اترنے والے سپرنٹنڈنٹ خان، بالے، اسرار، ابراہیم اور رؤف تھے۔ خان اس وقت ایک سفید پوش بنیے کے روپ میں تھا اور بالے بکنگ ایجنٹ کے بھیس میں۔ اسرار، ابراہیم اور رؤف فاصلے پر تھے۔

"تم نے ایکسپریس کے لیے بک کیا تھا نا؟" خان نے بالے سے پوچھا۔

"جی، آپ کی دعا ہے۔" بالے بولا۔

"تو شیڈ میں چل کر دیکھو۔" وہ یہ کہتے ہوئے داہنے ہاتھ پر گھوم کر مال گودام کے بکنگ آفس میں گھس گیا۔

"کیا بات ہے؟" ایک کلرک نے اس کی شکل دیکھتے ہی پوچھا۔

"صبح ہم نے ایک پارسل بک کیا تھا ۲۴ اپ کے لیے جس میں آلو بخارے کی جگہ میرے گدھے اسسٹنٹ نے اونٹ کی مینگنیاں بھر دی ہیں۔"

"اونٹ کی مینگنیاں؟" کلرک حیرت سے بولا۔

"جی ہاں، وہ دراصل غبن کرنا چاہتا تھا، اس لیے پارسل کو واپس لینا چاہتا ہوں۔" سیٹھ نے کہا۔

"آپ اسے گڈس شیڈ میں تلاش کر لیجیے پہلے، تب تک میں اپنا ہاتھ کا کام ختم کر لوں۔" کلرک نے اسے اجازت دے دی۔

"بہتر ہے، بہتر ہے۔ شکریہ۔" یہ کہتا ہوا وہ آدمی اپنے آدمیوں کی طرف مخاطب ہوا۔ "ڈھونڈ واسے جلدی سے، ورنہ مال اسی گاڑی سے چلا گیا تو میں تم میں سے ایک ایک کا سر

Akram Allahabadi

توڑدوں گا۔" وہ بگڑنے والے انداز میں انھیں ہدایت کرنے لگا۔ اور بالے اور اسرار بظاہر سہمے سہمے سے گڈس شیڈ میں چلے گئے۔ وہ تقریباً دس منٹ کے بعد ایک چھوٹا سا پارسل لے کر باہر نکلے۔

"ایسے کوئی بورے اندر نہیں ہیں۔" ان میں سے ایک نے آہستہ سے ٹھیکیدار سے کہا۔

"ہم۔ خیر تم یہ پارسل اس بابو کے پاس لے جا کر بہانہ چکا دو، میں پلیٹ فارم پر ہوں۔" یہ کہتا ہوا وہ اپنے سفید کرتے کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے ٹہلتا ہوا باہر پلیٹ فارم پر نکل آیا۔ ٹرین کے آنے میں اب صرف دس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ بالے اور اسرار جلد ہی لوٹ آئے۔ خان نے اشارے سے اسرار کو قریب بلا لیا۔

"ابراہیم کو یہاں چھوڑ دو اور تم اور رؤف جس طرح بھی ہو سکے اس گڈس ٹرین کو دوڑ کر پکڑو جو ابھی ایک گھنٹہ قبل یہاں سے روانہ ہوئی ہے۔ یہ گاڑی اسے راستے میں ہی کراس کر جائے گی۔ تمھیں موٹر پر پیچھا کرنا پڑے گا اور کسی طریقے سے بھی راستے میں ہی اس کے ان ڈبوں کی تلاشی لے ڈالو جن میں پٹ سن یا دوسری کسی ایسی ہی چیز کے بورے بھرے ہوں۔ لمبے پیکنگ بھی ادھر سے ہی دیکھ ڈالنا۔" خان نے آہستہ سے اسرار کو ہدایت کی۔

"لیکن اگر ہمیں چور سمجھ کر دھر لیا گیا تو؟" رؤف نے قریب آ کر پوچھا۔

"تم جانتے ہو کہ ایسے موقعوں پر کیا کرنا چاہیے۔ بیسیوں کیس پکڑے ہیں تم نے، یہ کوئی نئی بات نہیں۔" خان نے کہا۔

"اچھا، صاحب۔ آپ اطمینان رکھیے، ہم لوگ یہ کام کر کے ہی آتے ہیں۔" رؤف نے یقین دلایا۔

"آتے نہیں، اگر کوئی شبہ ہو تو فوراً ضد کر کے گاڑی رکوا لو، بلکہ ضرورت پڑے تو ریلوے پولیس کی بھی مدد لے لینا اور مجھے دربار ہوٹل میں فون کر دینا۔" خان نے انھیں ہدایت

Akram Allahabadi

کی۔

"بہتر ہے۔" اسرار بولا۔

اور اسی وقت وہ دونوں وہاں سے کھسک گئے۔ صرف ابراہیم اور بالے اب خان کے ساتھ رہ گئے۔ یکا یک خان کی نظریں اس قد آور سانولی شکل کے سوٹڈ بوٹڈ آدمی پر جم گئیں جو ابھی ابھی ایک برقعہ پوش خاتون اور دو مردوں اور ایک دوسری عورت کی معیت میں اندر داخل ہوا تھا۔ برقعہ پوش عورت شاید بیمار معلوم ہوتی تھی، کیونکہ دوسری عورت نے اسے بازو سے تھام رکھا تھا۔ اس کا دوسرا بازو خود وہ مرد تھامے ہوئے تھا۔ برقعہ پوش عورت کے قدم شاید نقاہت کی وجہ سے لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ پلیٹ فارم کے فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں داخل ہو گئے۔

"مجھے یہ اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا۔" خان نے بالے کو اشارے سے بتایا۔

"ہم نے کیا اچھے برے کا بھی ٹھیکا لیا ہے؟"

"کم از کم برے آدمیوں کا تو لیا ہے۔"

"تو پھر ذرا چل کر ادھر ہی ٹہلیے۔" بالے نے رائے دینے کے ساتھ ساتھ خود ہی قدم آگے بڑھا دیا۔

وہ اب فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کے سامنے سے ٹہلتے گزرنے لگے۔ عینک کے شیشوں کی اوٹ سے نیم نگاہیوں سے ویٹنگ روم کے اندر ہی دیکھ رہا تھا، مگر اندر بیٹھنے والوں نے اس چالاکی سے کمرے کی کھڑکی کا ایک پٹ بھیڑ دیا تھا، جس سے کہ اس کے بند ہونے کا شبہ نہ ہو اور کوئی صاف طور پر اندر بھی نہ دیکھ سکے۔ دوسری بار آگے جا کے ٹہلتے ہوئے لوٹنے پر بالے اچانک چونک پڑا۔

"باس۔" وہ بولا۔

"کیا بات ہے؟" خان نے پوچھا۔

"شاید کسی وجہ سے وہ نقاب الٹنا چاہتی تھی، مگر اس آدمی نے اندر بھی اسے نقاب الٹنے نہ دیا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔" بالے نے بتایا۔

"ہوسکتا ہے وہ شکی طبیعت مرد ہو۔"

"اب آپ 'ہوسکتا ہے' تو ہر جگہ استعمال ہونے لگتی ہے۔"

"شٹ اپ۔" خان نے آہستہ سے ڈانٹا۔

"وہ دیکھیے، اسے کھانسی آرہی ہے۔" بالے نے ان سنی کرتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔ اور واقعی وہ برقعہ پوش خاتون اندر بری طرح کھانس رہی تھی اور کھانسی کے ہر جھٹکے کے ساتھ جب اس کا نقاب ہلتا تھا تو اس کے ساتھ والی عورت کچھ اس انداز سے اس کا سر تھام لیتی جس سے وہ الٹ نہ پاتا۔ اتنے میں پلیٹ فارم کی گھنٹی بجی اور گاڑی آگئی۔ تمام مسافر اپنے اسباب سنبھال کر دوڑے اور قلیوں نے بھی شور مچادیا۔ ٹھیک اسی وقت داخلی دروازے پر پولیس ہر لمبے ٹرنک یا لمبے بستر کو کھول کر دیکھ رہی تھی اور اپنا اطمینان کرنے کے بعد اندر جانے دیتی۔ مسافروں کو اس تلاشی کا سبب بھی نہیں بتایا جارہا تھا۔ جیسے ہی وہ آدمی اس برقعہ پوش خاتون کر لے کر ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں چڑھنے لگا، ہجوم میں کھسکتے کھسکتے خان ڈبے کے قریب آگیا۔ کمپارٹمنٹ کے فٹ بورڈ پر قدم رکھتے ہوئے برقعہ پوش خاتون سے کوئی سفید سی چیز نیچے پلیٹ فارم پر گر پڑی۔ وہ سفید رومال تھا جو کافی میلا سا نظر آرہا تھا۔ ٹھیکیدار نے جھک کر اس احتیاط سے اسے اٹھایا کہ کوئی دیکھ نہ سکا۔ وہ اس کے کونے پر نظر ڈالتے ہی چونک پڑا۔ اس پر انگریزی میں (S) بنا ہوا تھا، لیکن اب وقت بالکل نہیں تھا اور گاڑی نے سیٹی دے دی۔ گاڑی کے اسٹارٹ ہوتے ہی خان نے دوڑ کر فرسٹ کلاس کے پچھلے ڈبے کے ایک دروازے کا ہینڈل تھام لیا۔ اس کی دیکھا دیکھی بالے سے بھی نہ رہا گیا۔ وہ بھی اچک کر اس ڈبے کے دوسرے دروازے سے لٹک گیا۔ اس دراز قد آدمی کے ساتھ کے دوسرے دو آدمی انھیں رخصت کر کے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ گاڑی پلیٹ فارم سے بمشکل ۱۰۰ گز بھی نہ بڑھ پائی تھی کہ

رکنے لگی۔خان نے ہی زنجیر کھینچ لی تھی۔گاڑی کے رکتے ہی وہ اتر کر فرسٹ کلاس کی طرف دوڑا۔بالے بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ادھر سے ٹرین کا گارڈ بھی اسی طرف آرہا تھا۔سپرنٹنڈنٹ خان نے فرسٹ کلاس کا بند ڈبا باہر سے ٹھوکنا شروع کر دیا۔اس کی اس حرکت کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اس طرف دوڑ پڑے اور کمپارٹمنٹ کے سامنے ہجوم ہو گیا۔اسٹیشن پر متعین کردہ پولیس کے آدمی بھی فوراً آپہنچے۔

"کیابات ہے؟" ایک سب انسپکٹر نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"اغوا۔" خان صرف اتنا بولا اور پھر دروازہ ٹھوکنے لگا۔

"وہ بھاگا۔" مجمع میں سے کوئی فرسٹ کلاس اور اس کے پیچھے والے ڈبے کے پہلے جوائنٹ والے خلاء کے بیچ سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔پولیس فوراً دوڑ پڑی اور بمپروں کے اوپر سے کودتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔اس بھگدڑ سے دوسرے تمام مسافر کھڑکیوں سے باہر سر نکال کر دیکھنے لگے اور ایک عجیب سی سنسنی چاروں طرف پھیل گئی۔وہ اتنی دیر میں لائن کے اس پار کی تار کی دیوار پھاند کر چکا تھا، جہاں ایک کالے رنگ کی پرانے ماڈل کی کار پہلے سے کھڑی تھی۔اس میں بیٹھے ہوئے آدمی نے جلدی سے پچھلا دروازہ کھول دیا اور وہ اچھل کر اس میں جا بیٹھا۔کار فوراً ہی اسٹارٹ ہو گئی۔

اندر وہ برقعہ پوش خاتون فرش پر لڑھکی پڑی تھی اور دوسری عورت اس پر جھکی ہوئی تھی۔ٹھیکیدار سب سے پہلے اندر پہنچا۔شاید دروازہ اسی عورت نے کھولا تھا۔

"سرکار، وہ تو اس کا گلا دبا کر مارے ڈال رہا تھا۔مگر ابھی سانس چل رہی ہے۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم کون ہو؟" خان نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"مجھے انہوں نے ان کی نگرانی کے لیے آج ہی نوکر رکھا تھا۔" وہ عورت بولی۔"سرکار، میرے بچوں کی قسم مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کوئی ایسا آدمی ہے۔" وہ گڑگڑانے لگی۔خان نے

اس کی سنے بغیر بے ہوش خاتون کے چہرے سے نقاب الٹ دیا۔

"سوبھا۔" وہ اچھل پڑا۔"بالے، یہ اسی تصویر کے مطابق ہے نا؟" وہ پلٹ کر بولا۔

"وہی ہوگی، مگر وہ سالا نکل گیا۔" بالے نے کہا۔

"تم دوڑو، جائے گا کہاں۔" خان نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

"ارے واہ، یہ تو وہی مثل ہوئی کہ چڑھ جا بیٹا سولی پر۔" وہ بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

اتنے میں پولیس بھی اندر آ پہنچی۔ پولیس انسپکٹر اندر آتے ہی خان سے سوالات شروع کر دیے۔

یہ جان لینے کے بعد کہ بے ہوش لڑکی کو کوئی اغوا کر کے لے جا رہا تھا، وہ پوچھنے لگا۔

"آپ لڑکی کے کون ہیں؟"

"میں... میں یعنی کہ میں اس کا چچا ہوں۔" خان نے خفیف سی ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا۔ اتنے میں بیہوش لڑکی کروٹ بدلتے ہوئے کراہی اور سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"غسل خانے سے چلو میں پانی لے کر اس کے منہ پر مارو۔" انسپکٹر نے ایک سپاہی کو حکم دیا جو اسی وقت دوڑ کر چلو میں پانی لے آیا۔

پانی کے چھینٹوں سے وہ چونک پڑی اور آنکھیں کھول دیں۔ اتنے بہت سے آدمیوں کو اپنے گرد دیکھ کر وہ اور خوفزدہ ہو گئی۔]

"خدا کے لیے مجھے جانے دو، مجھے چھوڑ دو۔" وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ان سے التجا کرنے لگی۔

"گھبراؤ نہیں، تم اب پولیس کی حفاظت میں ہو۔" انسپکٹر نے نرمی سے کہا۔

"پولیس؟ تو وہ شیطان کہاں گیا؟" وہ چاروں طرف دیکھنے لگی۔

"وہ کون تھا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"وہ مجھے کلکتہ لے جا رہا تھا، وہ سور۔" کہتے کہتے وہ غصہ و غم سے رو پڑی۔

"اور تمہیں بھیجا کس نے تھا؟" خان بیچ میں ٹپک پڑا۔

Akram Allahabadi

"مسٹر، آپ خاموش رہیے، پولیس کے معاملے میں ٹانگ گھسیڑنے کی کوشش مت کیجیے۔" انسپکٹر نے اسے ڈانٹ دیا۔

"بہت اچھا، بہت اچھا، داروغہ جی۔"

"کیا...؟" انسپکٹر نے اسے گھور کر دیکھا۔

"آئی ایم ساری، داروغہ جی۔ ہمارے یہاں پولیس انسپکٹر کو داروغہ کہتے ہیں۔"

خان نے بظاہر سنجیدہ اور سہا ہوا جواب دیا۔ اور انسپکٹر منہ بنا کر پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں تو تم اس سے پہلے کہاں تھیں؟" انسپکٹر نے لڑکی سے پوچھا۔

"یہ میرے سوال کی نقل ہے۔" خان پھر بول پڑا۔

"تم چپ رہو۔" انسپکٹر کو تقریباً غصہ آ گیا۔

"آئی ایم ساری، مسٹر انسپکٹر۔" اس نے یہ کہتے ہوئے رخ دوسری طرف پھیر لیا اور انسپکٹر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا ہوا پھر لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں اسے نہیں جانتی، مگر مجھے ایک ایسے آدمی نے اسکے حوالے کیا تھا، جس کی قید میں میں چار دن سے پڑی تھی۔" لڑکی بتانے لگی۔ "اس کے ساتھی اسے چھوٹا باس کہتے تھے۔"

"تم ان کے قبضے میں گئیں کیسے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"میری کشتی بھوتیا جھیل کے بھنور میں ڈوب گئی تھی۔ اس کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ان کی قید میں پایا۔" لڑکی نے انکشاف کیا۔

"بھوتیا جھیل...؟" انسپکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ "عجیب بات ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"شوبھا۔" وہ بولی۔ نام سنتے ہی انسپکٹر چونک پڑا۔ اس کے چہرے کی درشتگی بھی ختم ہو گئی۔

"کماری جی۔" وہ مؤدب لہجے میں بولا۔ "معاف کیجیے گا، مجھے معلوم نہ تھا۔" اس

Akram Allahabadi

نے معذرت کی۔

"تو پہلے ہی پوچھ لینا نا۔" خان نے پھر لقمہ دیا۔

"تم چپ رہو، مسٹر۔" انسپکٹر نے جھنجلا کر پھر ڈانٹا۔ اور پھر کماری شوبھا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "معاف کیجیے گا، آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہو گی۔" وہ اب خوشامد پر اتر آیا اور خان کھڑا مسکراتا رہا۔

"آپ کو وہ جگہ یاد ہے جہاں آپ کو قید رکھا گیا تھا اور وہ آدمی جس کی قید میں تھیں آپ؟" انسپکٹر نے اس سے سوال کیا۔

"وہ اگر سامنے ہو تو پہچان لوں گی۔ جگہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" شوبھا نے بتایا۔

"آخر ان لوگوں کا مقصد کیا تھا؟" انسپکٹر نے دریافت کیا۔

"وہ کسی مال کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے اور کچھ عجیب سی گفتگو اس رات کر رہے تھے۔ ٦ آنکھیں، لیور... اور نہ جانے کیا کیا، مگر مجھے تو اس نے کہا تھا کہ میں تمہیں اپنے پاس رکھوں گا کلکتہ میں۔ تمہیں میں نے پسند کر لیا ہے اور اسی لیے تمہیں زندہ رہنے کا حق دیا جا رہا ہے۔" شوبھا نے صاف صاف بتا دیا۔

"اچھا تو وہ سور مرنے جینے کا حق بھی بانٹتا تھا۔" انسپکٹر نے بظاہر غضب ناک ہوتے ہوئے کہا۔

لیکن خان چھ آنکھوں اور لیور وغیرہ کے ذکر پر چونک پڑا۔

"جی ہاں تو پھر کیا ہوا؟" انسپکٹر کہنے لگا۔

"مجھے اس کے باہر کی دنیا کا کچھ معلوم نہیں۔ اس کے مکان کے بعد مجھے کسی ایک دوسرے مکان کی کسی اونچی منزل پر لے جایا گیا تھا، جہاں ایک کمرے میں یہ آدمی اور ایک ادھیڑ عمر اور وہی چھوٹا باس تینوں موجود تھے اور وہیں پر مجھے اس کے حوالے کیا گیا تھا۔"

Akram Allahabadi

"چین کس نے کھینچی تھی؟"

"میں نے۔" ٹھیکیدار بول اٹھا۔

"کیوں؟" گارڈ نے سوال کیا۔

"اس لڑکی کو بچانے کے لیے۔" اس نے اشارے سے بتایا۔

"کیا یہ صحیح ہے؟" گارڈ نے پولیس انسپکٹر سے دریافت کیا۔ اور انسپکٹر نے خان کو کسی قدر درشت نظروں سے دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"تو اس پر دستخط کر دیجیے آپ۔ اور اپنے آدمیوں کے لے کر گاڑی سے اتر جائیے۔ بہت ڈیٹینشن ہو چکی گاڑی۔" گارڈ نے انسپکٹر کی طرف ایک کاغذ بڑھایا۔ یہ رننگ چارٹ اور ڈیلی رپورٹ کا فارم تھا۔ انسپکٹر نے گاڑی کے ڈیٹنشن کے خانے میں اس کا سبب لکھ کر اپنے دستخط کرتے ہوئے عہدہ اور اپنا پولیس علاقہ لکھ دیا۔

"سب نیچے چلیے۔" انسپکٹر نے لڑکی، اس کے ساتھ والی عورت، خان اور دوسروں کی طرف اشارہ کیا۔ اور خود سب سے پہلے ڈبے سے نیچے اتر گیا۔ اس کے پیچھے سب ٹرین سے باہر آگئے اور گارڈ نے سیٹی دے دی۔ گاڑی کے روانہ ہونے کے بعد بھی پلیٹ فارم پر ریلوے اسٹاف اور دوسرے فالتو آدمیوں کی بھیڑ لگی تھی۔ انسپکٹر اس وقت شاید خان کی باتوں سے چڑ چڑا ہو گیا تھا۔ وہ سپاہیوں پر بگڑ گیا۔

"ہٹاتے کیوں نہیں سب کو۔ کیا نوٹنکی کا تماشا ہو رہا ہے۔" سپاہی فوراً مجمع کو منتشر کرنے لگے۔

"اہاں... اہاں... مابدولت رشتے ہیں سیٹھ جی کے۔" بالے ایک سپاہی سے، جو اسے دور ہٹنے کے لیے کہہ رہا تھا لڑ پڑا۔

"یہ کون ہیں آپ کے؟" انسپکٹر نے جھنجلاہٹ میں خان کی طرف اشارہ کر کے لڑکی سے پوچھا۔ وہ حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ اور پھر اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

Akram Allahabadi

"تو یہ آپ کا کوئی نہیں؟" انسپکٹر نے دوبارہ تصدیق چاہی۔ "آپ اسے پہچانتی ہیں؟"

"نہیں۔" لڑکی نے پھر گردن ہلا دی۔

"اوہ.. گرفتار کروا سے بھی۔ یہ بھی کوئی نمبری معلوم ہوتا ہے۔" انسپکٹر نے دو سپاہیوں کو حکم دیا۔ جو فوراً ٹھیکیدار کے اردگرد آ کھڑے ہو گئے۔

"اہاہا... چہ خوب، جیسے تمہارے باپ کا راج ہے، جسے چاہو گرفتار کر لو۔" بالے بگڑ کر گردن ٹیڑھی کیے سامنے آ گیا۔

"ہُم تو جی مینڈکی بھی چلیں نال ٹھکوانے۔" انسپکٹر نے اسے بھی لیا۔

"مینڈک بولیے نیسپیٹر صاحب۔ آپ جنسی غلطی فرما رہے ہیں۔" بالے نے کچھ اس انداز سے کہا کہ دور کھڑے ہوئے بہت سے لوگ بھی ہنس پڑے اور انسپکٹر اور جل گیا۔

"اسے بھی لو۔" انسپکٹر نے حکم دیا۔

☆☆☆☆☆☆

سفید پوش سیٹھ اور اس کا ایجنٹ بڑی فرصت سے پولیس ہیڈ کوارٹرز کے ہی ایک کمرے میں بٹھا دیے گئے تھے۔ کماری شوبھا کو کلکتہ لے جانے والا ایجنٹ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا، اس لیے پولیس ناکام واپس آ گئی تھی۔ پھر بھی وہ مطمئن تھے کہ کم از کم لڑکی تو بچا لی گئی، حالانکہ یہ ان کا کارنامہ نہ تھا۔

انسپکٹر شوبھا سے سوال و جواب کرنے کے بعد باہر نکلا ہی تھا کہ ڈی آئی جی آ پہنچا۔ وہ سب کے سلام کا جواب سر کے اشارے سے دیتا ہوا انسپکٹر کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اوپر چلا گیا۔ انسپکٹر اس کے پیچھے پیچھے ہی اس کے آفس میں پہنچ کر اس کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا۔

Akram Allahabadi

''یہ لڑکی کیسے ہاتھ لگی آپ کے؟'' ڈی آئی جی نے پوچھا۔

''حضور، میں ایک ایک مسافر پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی اس مرد کے ساتھ ریل میں سوار ہوتے ہوئے گھبرائی ہوئی سی تھی۔ اس لیے میں نے چلتی گاڑی روک دی اور اندر گھس گیا۔'' انسپکٹر نے سارا کارنامہ اپنے سر لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''میں نے تو سنا ہے کہ گاڑی کسی اور نے روکی تھی؟'' ڈی آئی جی نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

''حضور، وہ تو کوئی چار سو بیس بدمعاش ہیں جو لڑکی کو اس کے ہاتھ سے چھین کر اڑا لے جانا چاہتے تھے۔ وہ خود کو زبردستی لڑکی کا چچا بتاتا ہے، حالانکہ لڑکی اسے جانتی بھی نہیں۔'' انسپکٹر نے کسی قدر گھبراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''بلایے انھیں یہاں۔'' ڈی آئی جی نے حکم دیا۔

''بہت خوب۔'' انسپکٹر یہ کہہ کر ایڑیاں بجا کر چلا گیا اور چند منٹ بعد ہی نیچے سے ان دونوں کو ساتھ لے کر اوپر آ گیا۔

''آپ لوگ کون ہیں؟''

''صاحب، میں تو نمک مرچ کا بیوپاری ہوں اور یہ میرا کارندہ ہے۔''

''کارندہ، یعنی کلرک، منیجر، اکاؤنٹنٹ، کیشیر وغیرہ وغیرہ۔'' بالے نے خود ہی اپنی تشریح کر دی۔

''آپ خود کو لڑکی کا چچا بتاتے ہیں، حالانکہ وہ آپ کو پہچانتی بھی نہیں؟'' ڈی آئی جی نے پوچھا۔

''یہی تو بدقسمتی ہے، عالی جناب۔ زمانہ ایسا نازک آ گیا ہے کہ بیٹا اپنے باپ کو پہچاننا بھول گئے ہیں۔'' بالے پھر بول پڑا۔

''تم چپ رہو۔'' ڈی آئی جی اسے ڈانٹتے ہوئے گھورنے لگا۔

Akram Allahabadi

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اردلی نے آ کر ڈی آئی جی کے سامنے کسی کا ملاقاتی کارڈ رکھ دیا۔

"یہ لیجیے، کنور صاحب بھی آ گئے۔ اب ان لوگوں کی قلعی بھی کھل جائے گی۔" ڈی آئی جی انسپکٹر سے بولا اور پھر اردلی کو اشارہ کیا کہ انھیں اندر بھیج دو۔ اندر گھستے ہی کنور رنجیت سنگھ کی نظر پہلے خان پر پڑی۔

"اوہ، آپ یہاں۔" کنور نے حیرت سے کہا۔

"ہاں بھئی، دیکھیے نا۔ یہ لوگ مجھے شوبھا کا چچا تسلیم نہیں کرتے۔" خان نے کنور سے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر لڑکی تو خود انکار کرتی ہے۔" انسپکٹر جلدی سے بول پڑا۔

"وہ بہت چھوٹی سی تھی جب اس نے انھیں دیکھا تھا، اس لیے بھول گئی ہوگی۔" کنور نے ڈی آئی جی کی طرف مخاطب ہو کر اور خان کو آنکھ مار کر کہا۔

"اوہ، تو معاف کیجیے گا۔" ڈی آئی جی نے خان سے معذرت چاہی اور پھر انسپکٹر کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ ٹرین ان سیٹھ صاحب نے روکی تھی، یہی سب سے پہلے اندر گھسے تھے اور ان کی ہی مدد سے دراصل لڑکی بچ سکی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اپنا اعمالنامہ شاندار بنانے کے لیے اپنے اعلا افسروں سے اس طرح جھوٹ بولیں گے، جایئے۔" ڈی آئی جی نے انسپکٹر کو جھاڑ سنائی اور وہ گم سم، شرمندہ اور سہما ہوا سر جھکائے کمرے سے نکل گیا۔

شوبھا اس کے باپ کے حوالے کر دی گئی اور خان اور بالے دونوں ان کے ساتھ ہی باہر چلے آئے، لیکن ڈی آئی جی اس وقت بھی اپنے کمرے میں مشرق تا مغرب ٹہلتے ہوئے اسی حیرت میں کھوئے ہوئے تھے کہ کیا واقعی کسی پولیس سپرنٹنڈنٹ کی روح ان کی مدد کر رہی تھی۔

Akram Allahabadi

اس کی طرف سے فون پر دی گئی ہدایت اپنے نتیجے میں پوری اتری تھی۔

☆☆☆☆☆☆

واپسی پر وہ سب نواب مقدر جنگ کے یہاں ہی جم کر بیٹھ گئے۔ نواب صاحب کا اصرار تھا کہ کنور رنجیت اور کماری شوبھا بغیر چائے پیے نہیں جا سکتے۔ نواب صاحب کے یہاں ان کے اصول کے مطابق دو ایک مہمانوں کا کھانا اور چائے تو ہر وقت ہی تیار رہا کرتی تھی۔

ابھی وہ سلسلہ گفتگو شروع بھی نہ کر پائے تھے کہ اسرار اور ابراہیم دونوں آ پہنچے۔ خان انھیں دیکھ کر اپنی نشست سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"گاڑی ہم نے راستے میں ہی پکڑ لی تھی، ریلوے کراسنگ کے قریب۔ اور مہاجن پور کے اسٹیشن پر ریلوے پولیس اور گارڈ کی مدد سے ہم نے ان ڈبوں کی تلاشیاں بھی لیں، لیکن ان میں کچھ نہیں تھا۔"

"ان لوگوں کو شاید شبہ ہو گیا کہ پولیس کو کچھ سن گن ملی ہیں۔" خان نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"سالے کافی چالاک بھوت ہیں۔" اسرار بڑبڑایا۔

"تو پھر اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ابھی سارا معاملہ ادھر ہی ہے۔"

"ہاں۔ اور شوبھا کی بازیافت نے انھیں اور محتاط کر دیا ہو گا۔ ہمیں بھی اب اور زیادہ احتیاط برتنا ہو گا۔" خان بڑبڑایا۔

"خیر چلو آؤ اندر، چائے وغیرہ پی لو۔" یہ کہہ کر وہ پھر اس کمرے میں واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ابراہیم اور اسرار بھی آ کر دو خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

"چلو بھئی، ہماری بیٹی تو مل گئی۔" نواب مقدر نے چائے کی پیالی ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ لیکن سامنے بیٹھی ہوئی شوبھا کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا۔ وہ اب ایسی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی جس کی بہاریں زبردستی نامعلوم ظالموں نے لوٹ لی ہوں۔ اسے سمجھانے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔

"واقعی آپ نہ ہوتے تو ناممکن تھا یہ۔" کنور رنجیت نے ممنون لہجے میں خان سے کہا۔

"اور میرا ذکر خیر کسی محفل میں نہیں۔" بالے پھر بیچ میں ٹپک پڑا۔

"آپ کا کیا کہنا ہے۔ آپ نہ ہوتے تو ساری دنیا ہی نہیں ہوتی۔" خان خود ہی چائے کی چسکی لیتے ہوئے بول اٹھا۔

"تھینک یو سر۔ تھینک یو میری مچ۔"

"میری مچ ؟" بیگم صاحبہ چونک پڑیں۔ وہ آج خوشی کے موڈ میں تھیں۔ ان کی گمشدہ منہ بولی بھتیجی جو غیر متوقع طور پر مل گئی تھی۔

"یعنی کہ میرا بہت بہت شکریہ۔" بالے نے وضاحت کر دی اور سب ہنس پڑے سوائے اسرار کے۔

"جملہ پرانا ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔ بالے کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"تم چپ بیٹھو، کھونسٹ۔ پرانوں کو ہر چیز پرانی ہی معلوم ہوتی ہے۔" بالے نے پھر اسے ڈانٹ دیا۔ لیکن شوبھا کو یہ مسکراہٹیں، یہ خوشگوار ماحول جیسے کاٹے کھا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"اب آپ ہی سمجھائیے اسے۔" کنور صاحب نے ملتجی انداز میں خان سے کہا اور خان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اس کمرے میں چلا گیا۔

"بیٹی۔" اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر سر ٹیک کر سسکیاں بھرتی ہوئی شوبھا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ کیا چیز تمہارے ہونٹوں کی گئی ہوئی مسکراہٹ واپس لا سکتی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اسے واپس لا دوں گا۔"

"میری روح انتقام کی پیاسی ہے، چاچا جی۔"

میں ان سور کے بچوں کی بوٹیاں نچتی دیکھنا چاہتی ہوں اپنی آنکھوں سے۔"

"میں... میں..." وہ غصہ و غم کی شدت سے کچھ اور نہ کہہ سکی۔

"میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں شوبھا۔ لیکن کیا تم سمجھتی ہو کہ انھیں معاف کر دیا جائے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک میں ان میں سے ایک ایک کو سزا کو نہ پہنچوا دوں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" خان نے وعدہ کیا۔

"آپ کتنے اچھے ہیں، چاچا جی۔" وہ شکر گزاری کے احساسات سے مغلوب ہو کر رونا بھول گئی۔

"اچھا، اب اداس رہنا چھوڑ دو، یہ بھی ایک حادثہ تھا جو ہو گیا۔ اسے رونے سے کوئی فائدہ نہیں، اس سب کے باوجود تم فرشتوں کی طرح معصوم اور پاکیزہ ہو، چلو اٹھو۔" اس نے پدرانہ شفقت سے اسے بازو سے تھام کر اٹھایا اور پھر میز پر لے آیا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

ناکام حملہ

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں نہیں ہے۔" پیلی کوٹھی سے نکلتے ہوئے بالے خان سے جھگڑنے لگا۔

"بیٹے، انسانیت کی خدمت ہی سب سے مقدس فریضہ ہے۔" خان نے جواب دیا۔

"تو اب آپ فریضہ ادا فرمایے، بندہ تو چلا۔" وہ سیڑھیوں سے کھسکنے لگا۔

"چلیے کہا، نمک حرام۔" خان نے اسے گردن سے تھام کر کار میں دھکیل دیا۔

"تم ایسا کرو۔" وہ اسرار کی طرف مخاطب ہوا۔ "کہ بمبئی کے خوان احمدی ہوٹل کو ایک تار فوراً دے دو۔"

"کیا گرم گرم کھانا منگوانا ہے؟" بالے پھر بول پڑا۔

تم چپ رہو۔ ہاں تو، خوان احمدی کو تار دو کہ مونچھوں کا پارسل فوراً بھیج دو۔"

"مونچھوں کا پارسل؟" بالے نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں، تم جیسے نالائقوں کے سمجھنے کی بات نہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ گاڑی اسٹارٹ کر ہی رہا تھا کہ ابراہیم آ پہنچا۔

"میں کب سے آپ ہی کو ڈھونڈ رہا تھا۔" وہ سلام کر کے بولا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"اسی انشورنس بلڈنگ سے نواب خرم ابھی ابھی اسی آدمی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گئے ہیں جو شوبھا کو کلکتہ لے جا رہا تھا۔" ابراہیم نے بتایا۔

"اور تم پیچھا کرنے کی بجائے یہاں چلے آئے؟" خان نے کسی قدر نا خوشگوار لہجے

Akram Allahabadi

میں پوچھا۔

"مجھے معلوم ہے وہ کہاں گئے ہیں، اس لیے خبر دینے آیا ہوں۔" ابراہیم نے بتایا۔

"کہاں؟"

"بھوتیا جھیل کی طرف۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"جب وہ دونوں کار میں بیٹھ رہے تھے، میں ان جان بن کر ایک خونچے والے کے پاس کھڑا تھا۔ ان میں سے نواب خرم کی آواز میں نے ڈرائیور سے یہ کہتے ہوئے سنی تھی کہ جھیل کی طرف لے لو۔" ابراہیم نے کہا۔

"بالے، تم جلدی سے نواب صاحب کی کار لے آؤ۔" خان نے بالے کو دھکیلتے ہوئے کہا۔ اور وہ فوراً کوٹھی کے گیرج کی طرف چل دیا۔

"مگر یہ نواب خرم ہے کیا بلا؟" اسرار نے پوچھا۔

"یہ راز آج ہی کھل جائے گا شاید۔" خان نے مختصراً جواب دیا۔

"ویسے آپ کبھی ان سے ملے ہیں؟"

"ان کو میں اسی دن پہچان چکا ہوں جب بالے ٹیکسی ڈرائیور بن کر اس اونٹ کو رات کے وقت رادھیکا انشورنس بلڈنگ تک لے گیا تھا۔" خان نے بتایا۔

"تو تب آپ کہاں تھے؟"

"میں خود دربار ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا تھا، کیونکہ ایک دن شام کو میں نے جن دو آدمیوں کو سطوت مرزا کے بنگلے سے نکلتے دیکھا تھا وہ مجھے اس ہوٹل میں داخل ہوتے نظر آئے تھے۔ اس وقت وہ دونوں، یعنی نواب خرم کا ایجنٹ اور کلکتہ والا ایجنٹ ہوٹل ہی میں موجود تھے اور وہ دراز قد جرنلسٹ انھیں بیٹھا گھور رہا تھا۔"

"لیکن نواب خرم اور سطوت مرزا میں دوستی بھی تو ہو سکتی ہے؟" اسرار پوچھنے لگا۔

Akram Allahabadi

"دوستی علاحدہ چیز ہے، لیکن کیا وہ پیغام تعجب خیز نہیں جو فون پر سطوت مرزا نے اس دعوت والی رات کو وصول کیا تھا اور میں نے تم کو بتایا تھا۔ ۶ آنکھیں یعنی ۳ عورتیں اور ۶ بیضے یعنی ۳ مرد اور لیور وغیرہ۔"

"یہ منطق اپنی سمجھ میں نہیں آئی، کوئی نیا الجبرا ہے کیا؟" بالے پیچھے سے آکر بولا۔ اور جب خان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بول اٹھا۔

"ڈرائیور گاڑی نکال رہا ہے، چابی اور پرچی، منگائی ہے۔"

"تمھیں بمبئی والا وہ کیس یاد ہے، ڈاکٹر منکر کا؟"

"ڈاکٹر منکر... اوہ، وہ تو بہت پرانا کیس ہے، جب میں نیا نیا نازل ہوا تھا پولیس میں۔" بالے بولا۔

"ڈاکٹر منکر نے بھی ایسی ہی حرکتیں کی تھیں۔ وہ اچھی صحت والے جاں بلب زخمیوں کی آنکھیں، گردے اور غدود وغیرہ زندہ حالت میں نکال لیا کرتا تھا۔ اس طرح بیچارے زخمی تو قبل از وقت ہی مرجاتے تھے، لیکن یہ چیزیں اسے کارآمد حیثیت میں مل جاتی تھیں۔ وہ انھیں ادویات میں ڈبو کر محفوظ رکھتا اور بڑے مہنگے داموں جرمنی کے سرجیکل ریپلیسمنٹ ڈپارٹمنٹ کے ہاتھوں خفیہ طور پر فروخت کیا کرتا تھا۔ میں نے اور انسپکٹر کولو نے ہی اسے پکڑا تھا۔" خان نے بتایا۔

"پھر کیا ہوا اس کا؟" ابراہیم نے حیرت سے پوچھا۔

"پھانسی۔"

"باپ رے۔ یہ تو بڑی درندگی کا کام ہے۔" اسرار کان تھامنے لگا۔

"اس دنیا میں ایک سے ایک ذلیل انسان پڑے ہوئے ہیں۔" خان بولا۔

"لیکن آپ یہ ۶ آنکھیں اور ۶ بیضے سمجھے کیسے؟"

"اس کے بھی کوڈ اسی قسم کے تھے۔ آنکھیں عورتوں کی آنکھوں کے لیے استعمال

Akram Allahabadi

ہوتی تھیں اور ہر دو آنکھ کا ایک جوڑا ہوتا تھا۔ مردوں کی آنکھیں اس کے تار میں 'سنک' لکھی جاتی تھیں۔ اسی طرح وہ ہر ایسے زخمی کا آپریشن کر کے اس کے چار غدود نکالا کرتا تھا۔ دو نچلے اور دو کنپٹی والے۔ جو نا مردوں کو مرد بنانے کے لیے زیادہ کام کے ہوتے ہیں۔ اور چار غدودوں کا مطلب ایک آدمی۔ یہ غدود اس کے تار میں 'انڈے' (بیضہ) کہلاتے تھے۔" خان نے انھیں سمجھایا۔

"بڑی پرانی بات یاد کی آپ نے۔"

"وہ کیس تھا ہی عجیب سنسنی خیز نوعیت کا، اسی لیے اس کی ہر بات اب تک میرے ذہن میں ہے۔" خان نے کہا۔

"آپ اس حرام موچھ کو کیوں بلوا رہے ہیں؟" بالے نے پوچھا۔

"میں اسے اور ابراہیم کو ہوائی جہاز سے کلکتہ بھیجوں گا، تاکہ وہ جلد از جلد وہاں اس فرم کا پتا چلا کر خبر کریں جو ان چیزوں کی خفیہ تجارت کر رہی ہے۔ ضرور یہیں سے اسے انسانوں کا مال فراہم کیا جا رہا ہے۔"

"کیوں کیا کلکتہ میں قحط الرجال واقع ہوا ہے؟"

"نہیں، اتنے سنگین جرائم کے لیے وہ وہیں کے لوگوں پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے، ورنہ بھانڈا پھوٹ جائے فوراً۔" خان نے بتایا۔

"بھئی، آپ تو آپ سے کیا سے کیا حل نکال لیا کرتے ہیں۔ اپنا تو بھیجا کام نہیں کرتا۔ آپ ضرور جنات ہیں۔" بالے خان کے سامنے کان پکڑتے ہوئے بولا۔

"سیکھ لو، بیٹے، ورنہ پچھتاؤ گے ہمارے بعد۔" خان نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

"ہونہہ، یہ نالائق سیکھے گا؟" اسرار بول پڑا۔

"نہیں تو تم، جسے آج تک یہ بھی نہیں معلوم کہ اونٹ کی دم کدھر ہوتی ہے۔" بالے نے جل کر جواب دیا۔

Akram Allahabadi

"اُدھر ہوتی ہے۔" ابراہیم نے اشارہ کیا۔سامنے کی طرف سے کسی بس سے اتر کر لانگ فیلو آرہا تھا۔

"یہ کہاں آمرا،کمبخت۔"بالے بڑبڑایا۔"آپ اسے کب سے جانتے ہیں؟"

"پہلے مجھ سے مل چکا ہے۔"خان نے بتایا۔"اچھا آدمی ہے،آنے دو۔پولیس کے سب سے اچھے دوست یہی لوگ ہوتے ہیں۔"خان پھر بولا۔

"مگر یہ مال یہاں سے کون سا پارسل کیا جاتا ہے؟"بالے نے پھر وہی ذکر چھیڑ دیا۔

"ارے بھئی،یہ بھوتیا جھیل اور کیا ہے۔کتنے بے گناہ انسان تو اس کی نذر ہو چکے ہیں اب تک۔"خان نے بتایا۔

"تو آپ کا مطلب کہ یہاں سے آدمی غائب ہو کر کہیں اور پہنچ جاتے ہیں۔"

"اب کل پرسوں میں خود ہی دیکھ لینا۔"خان نے کہا۔

لانگ فیلو نے قریب آتے ہی بلند آواز میں سب کو سلام مارا۔بالے نے تو منہ بنالیا،باقی سب نے ہنس کر جواب دیا۔

"اور سنا آپ نے،نواب خرم کے کرتوت؟"وہ قریب آکر بولا۔

"کیوں کیا ہوا؟"خان نے انجان بن کر پوچھا۔

"وہ انشورنس وغیرہ سب ڈھونگ ہے۔آج وہاں دیوالیہ کا بورڈ لٹکا ہوا ہے۔"

"وہ سب ٹٹی کی آڑ تھے،بیٹے۔"بالے بول پڑا۔

"اے،مسٹر سارجنٹ،قد میں میں آپ کے قبلہ و کعبہ سے بھی بڑا ہوں۔"وہ بے دھڑک کہہ اٹھا۔اور سب ہنس دیے۔

"کُلِّ طویلاً احمق الاحمرؔ۔"بالے نے عربی کا ایک مقولہ پیش کر دیا۔

"کہہ لو،اپنی تسکین کرلو۔"لانگ فیلو بات ٹالتے ہوئے ہنس دیا۔

Akram Allahabadi

اتنے میں کار باہر آ گئی۔ ڈرائیور کار روک کر اتر گیا اور وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے۔
خان نے لانگ فیلو کو بھی بٹھا لیا اور کار خود ڈرائیو کرنے لگا۔ اسرار، رؤف کو تار دینے چلا گیا۔

"آخر ارادہ کہاں کا ہے؟" بالے نے پوچھا۔

"سطوت مرزا کے گھر۔" خان نے بتایا۔

"کیوں؟ وہاں کیا لعل گڑے ہیں؟" بالے نے پوچھا۔

باتوں باتوں میں ان کی گاڑی سطوت مرزا کے بنگلے کے احاطے میں داخل ہو گئی۔
سطوت مرزا کا ملازم اس وقت انھیں اچانک دیکھ کر چونک پڑا۔ اس نے یہ کہہ کر کہ صاحب غسل خانے میں ہیں، سب کو ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا۔ مگر جیسے لانگ فیلو کی نگاہیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟" بالے نے آہستہ سے پوچھا۔

"یار، سوچ رہا ہوں کہ میں یہاں پہلے کبھی آیا ہوں۔"

"آل آف یو اٹنشن، پلیز۔" اندرونی دروازے کی طرف سے ایک کڑکتی آواز سنائی دی اور سب چونک پڑے۔

"لیفٹ رائٹ... لیفٹ... رائٹ... خرررز... بز..." یہ پاگل چچا کی آواز تھی جن کا ذکر خان لانگ فیلو کے علاوہ نواب صاحب مقدر کے بچوں سے بھی سن چکا تھا۔ وہ ایک ہلکا سا قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

ان کے ہاتھ میں اس وقت ایک بندوق تھی، جو ممکن ہے سطوت مرزا کے کمرے سے اٹھا لائے ہوں۔

"کہاں گیا وہ اوٹ کا بچہ؟ میں اس کا پیٹ پھاڑ کر اس میں گدھے بھر دوں گا۔ سامنے لاؤ اسے ہمارے۔ خرررز..." وہ کسی سنتری کی طرح بندوق کندھے پر رکھ کر صوفوں کا چکر کاٹنے لگے۔

Akram Allahabadi

"انکل، انکل۔" دروازے کی طرف سے طلعت مرزا کی گھبرائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔خان چونک کر ادھر متوجہ ہو گیا۔

"چاچا کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق ہے۔خدا کے لیے کسی طرح ان سے لے لیجیے، ورنہ کسی پر چلا دی تو۔" وہ آہستہ لہجے میں بولا۔جسے سنتے ہی بہانے سے خان اپنی نشست سے اٹھ ہی رہا تھا کہ اسے خرم کے پاگل چچا نے ڈانٹ سنائی۔

"خبردار، بیٹھ جاؤ، ورنہ ہم توپ چلا دیں گے۔ہم نے اس میں الو کے انڈے بھرے ہیں۔کیا تمھیں نہیں معلوم کہ ہم سپرنٹنڈنٹ پولیس آف جنت ہیں۔خررر... بز..." یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنی بندوق کا رخ خان کی طرف کر دیا۔

"بھئی، واقعی آپ کا نشانہ خوب ہے، لیکن آپ کو معلوم ہے اس وقت جنت میں کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا ہو رہا ہے؟ ہمیں بے وقوف مت بناؤ۔ہم باری باری سے تم سب کو شوں شوں کر دیں گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ بندوق کی نال اور قریب لے آئے۔

"اونہونہہ... ادھر جنت میں اس وقت بغاوت ہو گئی ہے اور آپ کا وہاں انتظار کیا جا رہا ہے۔"

"ہشت، ہم کو بناتے ہو۔ ہمارا انتظار کرنے والے سب مر چکے اور تم بھی جاؤ ان کے ساتھ۔" یہ کہتے کہتے انگلی ان کی بندوق کی لبلبی پر پہنچ گئی اور سب سہم گئے۔خان کی زندگی اس وقت واقعی خطرے میں تھی، لیکن اچانک ابراہیم نے، جو سرے پر علاحدہ کرسی پر بیٹھا تھا، اپنی جگہ سے کسی چیتے کی طرح جست کی اور پاگل چاچا پر آ گرا۔بندوق کی نال کا رخ چھت کی طرف ہو گیا اور دھماکے کے ساتھ گولی جا کر چھت میں لگی۔اب بالے اور لانگ فیلو بھی ٹوٹ پڑے اور پاگل چاچا کو قبضے میں کر لیا گیا۔

"آج انھیں پاگل پن کا سخت قسم کا دورہ پڑا ہے۔آپ انھیں پیچھے کے کمرے میں

بند کر دیجیے۔'' سطوت مرزا نے قریب آتے ہوئے مشورہ دیا۔ چنانچہ انھیں ایک پچھلے کمرے میں بند کر دیا اور ان کی بندوق چھین کر سطوت مرزا کو دے دی گئی۔

''ارے، یہ آپ نے کیا کیا؟'' بالے نے آہستہ سے اظہارِ حیرت کیا۔

''خاموشی سے دیکھتے رہو۔'' خان نے اسے ڈانٹ دیا۔

دوسری طرف سے لانگ فیلو اس کے قریب کھسک آیا۔ اس وقت سطوت مرزا باہر دروازے پر کھڑا نوکر کو چائے لانے کی ہدایت کر رہا تھا۔

''میں نے کہا، جناب، یہ پاگل صاحب وہی حضرت تھے جو مجھے نواب خرم کے یہاں سویرے سویرے ملے تھے۔'' اس نے دبی زبان سے خان کو بتایا۔

''یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، مگر ابراہیم نے اس وقت بڑا کام کیا، ورنہ کم از کم ایک تو ہم میں سے صاف تھا اور سطوت مرزا کا کچھ نہ بگڑتا، کیونکہ پاگل پھر پاگل جو ٹھہرا۔'' خان نے ابراہیم کی تعریف کی۔

''اب تو آپ نے سیانے کے ہاتھ میں بندوق دے دی ہے، قبلہ۔'' بالے پھر بولا۔

''ہمارے اس رویے سے اسے یہ احتمال بھی نہیں رہے گا کہ ہم اس پر کوئی شک رکھتے ہیں۔ دیکھتے نہیں، کتنا مطمئن نظر آ رہا ہے۔'' خان نے مسکرا کر بتایا۔

اور پھر وہ سب اپنے موڈ خوشگوار بنا کر نشستوں پر بیٹھ گئے۔ سطوت مرزا قریب آ گیا تھا۔

''بھئی، عجیب ہیں تمھارے چچا صاحب بھی، سطوت میاں۔'' خان نے بے تکلفی سے سامنے لا کر رکھی جانے والی ٹرے سے ایک سینڈوچ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''انکل، میرا ناک میں دم ہے ان سے۔ نواب خرم کے یہاں جاتے ہیں تو وہاں سے الٹے سیدھے فون کر کے مجھے پریشان کرتے رہتے ہیں اور یہاں رہتے ہیں تو مستقل

Akram Allahabadi

اودھم مچاتے ہیں۔"

"میاں سطوت، بھئی ہمارا جی تو سگار پینے کا چاہ رہا ہے۔" خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"سگار، ہاں ہاں، ابھی لایا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"بالے، تم کھسکو اور دیکھو جس کمرے میں ان پاگل صاحب کو بند کیا گیا ہے اس کی کھڑکیاں پیچھے ڈھلوان والی سڑک پر کھلتی ہیں، سمجھ گئے نا؟ ہم بعد میں آئیں گے، بلکہ ابراہیم کو بھی لیتے جاؤ۔"

"بہت اچھا۔" بالے نے کہا اور وہ اور ابراہیم دونوں اٹھ کر ڈرائنگ روم سے تیزی سے نکل کر باہر نکل گئے۔

سطوت مرزا دو منٹ بعد ہی آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں دو سگار تھے۔ ایک اس نے خود اپنے منہ سے لگا لیا اور دوسرا خان کی طرف بڑھا دیا۔ سگار کافی موٹی ساخت کے تھے۔

"ارے، وہ آپ کے دو ساتھی کہاں چلے گئے؟"

"میں نے انھیں ایئر لائنز کے آفس بھیجا ہے۔ ریزرویشن کینسل کرانے کے لیے۔ دراصل میں کل واپس جا رہا تھا، اس لیے دو نشستیں بک کرائی تھیں، مگر نواب صاحب کا اصرار ہے کہ ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔ چنانچہ اب پرسوں صبح جاؤں گا۔" خان نے بڑے نرم لہجے میں بتایا۔

"یہ نواب خرم کون ہیں؟" خان نے انجان بن کر پوچھا۔

"بتاتے تو یہ ہیں کہ ہمارے دور کے رشتے دار ہیں، بلکہ زیادہ تر ان کا پہلے ہمارے یہاں ہی ڈیرا رہتا تھا۔ اب کچھ ناراض رہتے ہیں، کیونکہ میں نے جانا آنا بہت کم کر دیا ہے۔"

"اور یہ پاگل چاچا؟"

"یہ ان کے ہی رشتے کے چھوٹے بھائی ہیں۔ بہت پریشان کرتے ہیں سب کو۔"

Akram Allahabadi

اس نے بلا جھجک جواب دیا۔

''خیر، پھر بھی دلچسپ آدمی ہیں۔ ایسے آدمیوں سے اور رونق رہتی ہے۔'' خان نے سلسلہ کلام جاری رکھا اور اسی دوران چائے کا ایک اور دور چل گیا جس میں چائے کا زیادہ عادی نہ ہوتے ہوئے بھی خان برابر کا شریک تھا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

تعاقب

"اِدھر، بھئی، اِدھر۔" بالے نے ابراہیم کا ہاتھ پکڑ کر ایک درخت کی آڑ میں کھینچ لیا۔ ڈھلوان کی سڑک پر سے وہی پاگل چاچا دور جا رہا تھا اور سطوت مرزا کے بنگلے کے اس کمرے کی پچھلی کھڑکی کھلی ہوئی تھی، جس میں اسے بند کیا گیا تھا۔ وہ بڑی آہستگی سے اس کا تعاقب کرنے لگے۔

"تم اس کا پیچھا پکڑے رہو، میں کار لے کر آتا ہوں۔ یقیناً یہ زیادہ دور پیدل نہیں جائے گا۔" اس نے ابراہیم کو سمجھایا۔ اور ابراہیم اپنے کام میں لگ گیا۔ بالے نے جست کی اور پیچھے سے گھوم کر کوٹھی کے سامنے کے رخ کی طرف چل دیا۔

ابراہیم بلی جیسے بے آواز قدم رکھتا ہوا اس سے صرف ۱۸۔۲۰ گز کے فاصلے پر پہنچ گیا محتاط انداز میں وہ پاگل چاچا بار بار پلٹ کر اِدھر اُدھر دیکھتا جاتا۔

یہ پتلی پختہ سڑک آگے جا کر شمال کی طرف گھوم گئی تھی۔ یہاں ایک اور بھی پتلا سا راستہ تھا جو مزید ڈھلوان کی طرف جاتا تھا۔ اس کی نکڑ پر ایک کار کھڑی ہوئی تھی، جس کا ڈرائیور سویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں کسی کار کا اس طرح موجود ہونا قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ پاگل چاچا اب دوڑنے لگا تھا اور کار کا ڈرائیور کسی کے دوڑتے قدموں کی چاپ سن کر ہی چونک پڑا۔ اس نے اسے دیکھتے ہی جلدی سے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پچھلا دروازہ کھول دیا اور ہانپتا ہوا پچھلی سیٹ پر جا گرا۔ کار فوراً ہی روانہ ہو گئی۔ ابراہیم کو یہاں پہنچ کر رک جانا پڑا۔ اس کا دل دعائیں مانگ رہا تھا کہ کاش بالے جلدی سے کار لے کر آ پہنچے۔ اور بمشکل دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ پیچھے سے کار کی زر زراہٹ نے اسے چونکا دیا۔ وہ جلدی سے کار کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا اور بالے نے ایکسیلیٹر اور دبا دیا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی رہیں۔شاید اگلی کار کو بھی تعاقب کا شبہ ہو گیا تھا، کیونکہ اس کی رفتار کافی تیز تھی اور کوئی اس کی پچھلی نشست پر پچھلے ونڈ اسکرین سے اپنا ہاتھ نکالے ہوئے تھا۔ممکن ہے اس میں بھرا ہوا ریوالور ہو۔ یہ سوچ کر بالے نے کار کا ونڈ اسکرین ذرا اونچا کر دیا، تاکہ اگر گولی لگے بھی تو پھسلتی ہوئی پڑے۔

"بالے بھائی، راستے میں اس وقت اگر کسی اور کی گاڑی مل جائے تو مزا آجائے۔" ابراہیم نے اپنی رائے دی۔

"مل جائے تب نا، اور وہ بھی اگر وہ ہمیں دے دے۔" بالے نے اسٹیئرنگ داہنے موڑ کی طرف گھماتے ہوئے کہا۔

"وہ...وہ..." ابراہیم چیخا۔اور واقعی شاید قدرت نے ان کی سن لی تھی۔سامنے جو گاڑی آرہی تھی، وہ کسی دودھ والے کی تھی، جس میں دودھ کے ساوار بھرے ہوئے تھے۔ان لوگوں نے اپنی گاڑی آڑی کر دی اور اسے گاڑی روک لینی پڑی۔

"بھائی، گاڑی کس کی ہے یہ؟" ابراہیم نے پوچھا۔

"نواب صاحب کی ڈیری کی ہے۔" ڈرائیور بولا۔مگر فوراً ہی وہ بالے کو پہچان گیا۔

"صاحب آپ۔" اس نے پوچھا۔گاڑی واقعی نواب مقدر جنگ کے ڈیری فارم کی تھی اور اس کا ڈرائیور جو ایک دن عارضی طور پر نواب صاحب کی کار پر بھی رہ چکا تھا، بالے کو پہچان گیا۔

"ذرا تمہاری گاڑی ہمیں دے دو، بہت ضروری کام ہے۔یہ میری گاڑی تم لے جاؤ۔" بالے نے نواب صاحب کی گاڑی اس کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

"مگر صاحب، اس میں دودھ بھرا ہوا ہے۔" وہ بولا۔

"جلدی سے اتار لو۔" بالے نے یہ کہہ کر خود ہی ہاتھ لگا دیا۔چنانچہ ایک نوکر، ڈرائیور، بالے اور ابراہیم کے ہاتھوں نے ذرا سی دیر میں اسے خالی کر دیا اور بالے اور ابراہیم

Akram Allahabadi

اس میں بیٹھ گئے ۔بالے نے اسے بھرپور رفتار پر چھوڑ دیا۔گاڑی جیپ ٹریلر تھی، اس لیے ہوا سے باتیں کرنے لگی۔تقریباً تین چار میل دوڑ کر انھیں وہ مفرور کار ایک ٹیلے پر چڑھتی ہوئی نظر آئی۔

''مار لیا سالے کو۔'' ابراہیم خوش ہو کر بولا۔

''ابھی کہاں، بیٹے۔ابھی تو بسم اللہ ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے گاڑی کو کچھ آگے لے جا کر ایک طرف ایک کھجور کے درخت کے پاس کھڑا کر دیا اور ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکیاں لاک کر کے دونوں اتر گئے۔وہ درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر تیزی سے اس ٹیلے کی طرف بھاگنے لگے اور تقریباً دس منٹ میں وہ وہاں پہنچ گئے۔اونچائی پر پہنچ کر انھوں نے دوسری طرف دیکھا تو وہ گاڑی انھیں کافی نیچے، ایک ایسی بہت پرانی اینٹوں کی عمارت کے قریب نظر آئی جس پر پون چکی لگی ہوئی تھی۔یہ چکی کے پر اب بھی ہوا سے آہستہ آہستہ کبھی نصف کبھی اس سے کم چکر کاٹتے تھے اور پھر لوٹ آتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ استعمال ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی۔استعمال ہوتی ہوگی تو کسی اور ذریعے سے، کم از کم ہوا سے تو اب وہ نا قابلِ عمل معلوم ہوتی تھی۔اب وہ کار اس عمارت کے پچھلے حصے میں ایک گیرج نما راستے سے داخل ہوگئی اور اس کا پھاٹک اس طرح بند ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

''ابراہیم، تم ٹیلے پر ٹھہر کر اس کی نگرانی کرو، میں خان صاحب کو خبر کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر بالے بھاگتا ہوا پھر پیچھے کار کی طرف بھاگا اور فوراً کار اسٹارٹ کر کے خان کی طرف چل دیا۔

☆☆☆☆☆☆

ڈی آئی جی، کنور رنجیت کی گمشدہ لڑکی شوبھا کے مل جانے سے کسی قدر مطمئن ہو گئے تھے، لیکن جرم اور تفتیش میں بھی جب پولیس اسے یا اس طرح دوسروں کو غائب کر دیے

والوں کا ہلکا سا سراغ نہ نکال سکی تو پھر پریشان ہو گئے۔ پبلک اور حکام بالا کی طرف سے طرح طرح سے دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ پولیس جس طرح ہو جلد از جلد اس بھوتیا جھیل کا راز حل کرے ورنہ حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ پچھلے ایک دو دنوں سے تو پولیس ہیڈ کوارٹرز اور چیف کمشنر کے دفتروں کے سامنے پبلک کے احتجاجی مظاہرے کا بھی ڈر تھا۔ آج شام کو وہ اسی فکر میں پریشان سے بہت دیر تک بیٹھے رہ گئے، ورنہ بالعموم وہ چار بجے شام تک دفتر سے چلے جاتے تھے۔ اس وقت انھیں وہ گمنام سپرنٹنڈنٹ کی روح یاد آ رہی تھی جس کے بارے میں اب تک انھوں نے سنجیدگی سے نہ سوچا تھا۔ ٹھیک ساڑھے ۶ بجے اچانک ان کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ہیلو۔'' انھوں نے تھکے ہوئے انداز میں رسیور اٹھا لیا۔

''میں ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس کی روح ہوں۔'' ادھر سے جواب ملا۔

''بھئی، میری کچھ مدد کیجیے، میں بہت پریشان ہوں۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''مدد ہی تو کر رہا ہوں آپ کی۔ آپ امین آباد کی سروے نمبر ۵۱۱ والی پہاڑی کے دامن میں بنی ہوئی ایک پرانی پون چکی پر جلد از جلد چھاپا ماریے، ورنہ موقع ہاتھ سے گیا تو وہ تمام جانیں جو بھوتیا جھیل کے بھوتوں کے قبضے میں ہیں تلف ہو جائیں گی۔'' روح نے کہا۔

''لیکن خدا کے لیے اب تو آپ سامنے آ جایئے کہ ہم آپ کی ان ہمدردیوں کا کم از کم شکریہ تو ادا کر سکیں۔'' ڈی آئی جی نے ممنون لہجے میں کہا۔

''اگر آپ اتنے ہی مشتاق ہیں تو میں وہیں ملوں گا یا پھر کل کسی وقت۔'' ادھر سے جواب ملا۔ ''لیکن آپ دیر بالکل نہ کیجیے، وقت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے رسیور رکھ دیا۔

ڈی آئی جی اس پراسرار پیغام پر پوری پوری طرح یقین رکھتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ سارے پولیس ہیڈ کوارٹرز میں کھلبلی مچ گئی۔ پولیس افسر جلدی سے پستول وغیرہ سے لیس ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے تین لاریوں میں بھری مسلح پولیس اور دو کاروں میں

Akram Allahabadi

دوسرے پولیس آفیسرز اور ڈی آئی جی ہیڈ کوارٹرز سے امین آباد کی طرف چل پڑے۔

سڑک پر لوگوں کی بہت بڑی تعداد حیرت سے پولیس کو اتنی تعداد میں اس طرح اچانک جاتے دیکھ رہی تھی اور ذرا سی دیر میں تمام سنسنی پھیل گئی۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

سپرنٹنڈنٹ کی روح

سورج ڈھلے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ امین آباد کے علاقے میں پہاڑی کے دامن والی پون چکی کا میدان پولیس کی سرچ لائٹوں سے چمک اٹھا اور تقریباً ۱۵۰ مسلح پولیس مینوں نے چاروں طرف پون چکی کی پرانی عمارت کو گھیر لیا، لیکن وہ تو اس طرح سوئی ہوئی تھی کہ جیسے یہاں چڑیا کا بچہ نہ ہو۔

"کہیں بیوقوف تو نہیں بنایا کسی نے اس سپرنٹنڈنٹ پولیس کی روح کے نام سے؟" ایس پی ہمت سنگھ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگے۔

"نہیں، وہی آواز تھی، میں پہچان چکا ہوں۔"

اچانک ایک فائر ہوا اور ایک گولی سنسناتی ہوئی سامنے کھڑے ہوئے ایک پولیس کانسٹیبل کے سینے پر لگی۔ وہ بے چارہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے سب فوراً زمین پر لیٹ گئے اور پھر چکی کی طرف سے تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں۔ ادھر سے مسلسل جواب دیا جاتا رہا اور اس فائرنگ کے تبادلے کے درمیان خود ڈی آئی جی، ایس پی ہمت سنگھ اور دو سب انسپکٹر عمارت کی پرانی دیوار سے چپک کر اندھیرے میں آگے کی طرف کھسکنے لگے۔

گولیاں اب بھی برس رہی تھیں اور کئی پولیس والے گھائل ہو چکے تھے، لیکن ادھر سے شور کی ہلکی سی آواز بھی نہ نکلتی تھی۔

اچانک میدان میں تین سائے ابھرے۔ ان کے ہاتھ میں سفید رومال تھا اور وہ مخالف سمت سے اس چکی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ رومال کا اشارہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ پولیس کے ہی آدمی یا مددگار ہیں۔ چنانچہ ان پر گولیاں نہیں چلائی گئیں، لیکن چکی کی طرف سے گولیاں برابر چلتی رہیں اور ادھر سے جواب دیا جاتا رہا۔

اب ڈی آئی جی، ایس پی اور دونوں سب انسپکٹر اس چکی کے سائے میں پہنچ کر گولیوں کی باڑھ سے محفوظ ہو گئے۔

لیکن ٹھیک اسی وقت اچانک فائرنگ رک گئی۔ اسی کے ساتھ ہی پولیس کی سرچ لائٹ کے سامنے کوئی ایک سیاہ سا سایہ نیچے چکی کی عمارت کے اس سمت کی دیوار کی اوٹ سے نکل کر میدان پار کرتا ہوا ٹیلے کی طرف بھاگا، لیکن چکی کی طرف سے اوپر سے ہی ایک مختلف آواز کا فائر ہوا اور وہ میدان میں ہی سرچ لائٹ کی روشنی میں گر پڑا۔

فائرنگ بند ہوتے ہی روشنیوں کا رخ اوپر چکی کے پنکھے کی طرف ہو گیا۔ وہاں اس وقت تین آدمی کھڑے تھے۔ ڈی آئی جی اور اس کے ساتھی بھی پچھلی پرانی سیڑھیاں احتیاط سے چڑھتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ وہ ان تینوں کو حیرت سے دیکھتے رہے۔

"آپ لوگوں نے اس اندھا دھند اور ایک ہی سمت کی باڑھ والے گولی بار کی وجہ بھی نہ سوچی اور اتنے فائر برباد کر دیے۔" ان میں سے ایک آدمی ڈی آئی جی سے بولا۔ "اگر میں یہاں تک نہ پہنچ جاتا تو شاید پولیس اپنا تمام میگزین خالی کر دیتی، جبکہ مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔"

"تو کیا یہاں کوئی نہ تھا؟" ایس پی ہمت سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھیے نا، وہ کمبخت کس چالاکی سے آپ لوگوں کو فائرنگ میں الجھا کر خود فرار ہو گئے۔ یہ دیکھیے پنکھے کی چکر کھانے والی راڈ کے ساتھ جو سیاہ سی چیز بندھی ہے۔ یہ مشین گن ہے جس میں پورا میگزین موجود تھا اور پنکھے کی جڑ کے اس پہیوں کے دانتوں سے اس نے گن کے گھوڑے کو بار بار جھٹکے سے دبا رکھنے کا کام لیا ہے۔ وہ صرف ایک بار اسے حرکت دے کر نیچے اتر گیا تھا اور تب سے یہ مشین گن پنکھے کی گردش کے ساتھ برابر اسی ڈائرکشن میں گولیاں برسا رہی تھی۔"

"یعنی یہاں اس وقت صرف ایک آدمی تھا؟"

"جی ہاں، وہی جو صحیح سلامت بھی بچ نکلتا اگر میں اس پر گولی نہ چلا دیتا۔" آگے والے تنومند اور ہنس مکھ آدمی نے جواب دیا۔ "وہ لاش میدان میں اسی کی پڑی ہے۔"

"بھئی، ذرا آپ پھر سے بولیے۔" ڈی آئی جی نے اس آدمی کو ٹوکا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟" وہ چونک کر بولا۔

"مگر میں سمجھ گیا۔ آپ وہی پولیس سپرنٹنڈنٹ کی روح ہیں۔" یہ کہہ کر ڈی آئی جی اس سے لپٹ گئے۔

"جی نہیں، جناب۔ یہ چاروں ہاتھ پاؤں سے زندہ ہیں۔" اس کے ساتھ والا بول اٹھا۔ "اور میں، یعنی ان کی اسسٹنٹ روح ہوں اور یہ دو اسسٹنٹ روح بھی زندہ ہے اور ایک فالتو وقت برباد کرنے گیا ہوا ہے۔" اس نے خود ہی اپنے ساتھیوں کی گنتی گنا دی۔

"آپ نے کئی بار ہماری بڑی بروقت مدد کی ہے۔ مجھے تو آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔" ڈی آئی جی نے گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں تو آپ سے مل چکا ہوں، قبلہ۔" وہ بولا۔

"یہ سنتے ہی ڈی آئی جی نے اس کے چہرے پر اپنی ٹارچ ڈال کر غور سے دیکھا اور ہنس پڑا۔

"تو آپ ہی نے وہ ٹرین والا معاملہ بھی پکڑا تھا۔ بھئی خوب، لیکن آپ ہیں ابھی تک صیغۂ راز۔" ڈی آئی جی نے گویا اصلی تعریف چاہی۔ ایس پی ہمت سنگھ حیران حیران کھڑا تھا۔ باقی آفیسر مؤدب تھے۔

"مجھے اگر کسی پولیس سپرنٹنڈنٹ کی روح نہ ستائے تو میں کہہ دوں کہ آپ بمبئی کے ممتاز سراغ رساں سپرنٹنڈنٹ حضور احمد خان ہیں۔" بالے سے نہ رہا گیا اور اس نے بھانڈا پھوڑ دیا۔

"خان صاحب!" ڈی آئی جی اور ہمت سنگھ دونوں اچھل پڑے۔ بھئی، تعریفیں تو

Akram Allahabadi

آپ کی میں نے سنسنی خیز سٹوریز سنی ہیں ۔ دہلی میں بھی چرچے رہتے ہیں آپ کے، مگر دیکھنے کا شوق آج پورا ہوا اور وہ بھی اس طرح کہ آپ کا احسان سر پر ہے۔'' ڈی آئی جی نے اب کی بار اور زیادہ گرمجوشی سے خان سے مصافحہ کیا۔

''ہائے رے قسمت، دنیا بھر کی نیکیاں کروں، مگر کس نے پرسد کہ بھیا کون ہو، سارجنٹ بالے ہو یا کوئی گھسیارے؟'' بالے نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''ارے، تو بالے صاحب آپ ہیں ۔ آپ تو شیطان کی طرح جانے جاتے ہیں خان صاحب کے نام کے ساتھ۔'' ایس پی ہمت سنگھ نے بالے کا ہاتھ تھام لیا۔

''یہ لیجیے، آپ نے ملاقات فرماتے ہی شیطان بنا ڈالا، پھر اور کیا تعریف ہوگی میری۔'' بالے نے روتی صورت بنا کر کہا۔ اس پر سب ہنس پڑے۔

''ہمیں جلد از جلد اندر سے اس عمارت کو چھان مارنا چاہیے، وہ لوگ فرار ضرور ہو گئے ہیں، لیکن وہ اپنے ان قیدیوں کو کہیں نہ لے جا سکے ہوں گے، جنھیں بھوتیا جھیل سے حاصل کیا گیا ہے۔'' خان نے ڈی آئی جی کو چونکا دیا۔

''قیدیوں کو؟'' ہمت سنگھ نے دہرایا۔

''اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان بے چاروں کی جانیں سلامت بھی نہ بچی ہوں ۔ اپنی موت سر پر دیکھ کر کھسیائے ہوئے لوگ بعض بڑے وحشیانہ کام بھی کر بیٹھتے ہیں۔'' خان نے کہا۔

چنانچہ اسی وقت اس پرانی اینٹوں والی عمارت کے تمام دروازے توڑ کر پولیس اندر گھس گئی ۔ اندر اندھیرا گھپ اور بھیانک سا سناٹا پھیلا ہوا تھا ۔ ٹارچوں کی مدد سے اس کا کونہ کونہ چھانا جانے لگا ۔ اس میں کئی کمرے تھے اور ایک بڑا سا تکنا ہال نما حصہ بھی، جس میں عجیب سی بدبو آ رہی تھی، لیکن تھا کچھ بھی نہیں ۔ ایک دوسرے کمرے میں، جو مقفل تھا، دروازہ توڑنے پر کچھ عجیب قسم کے سرجیکل اوزار ملے ۔ ان میں سے بعض چمٹیوں اور بعض نشتر نما چیزوں پر خون

Akram Allahabadi

کے ہلکے سے داغ بھی لگے نظر آئے۔باقی کمروں میں کہیں پھٹے ہوئے کپڑے اور کہیں لکڑیاں، بورے اور خالی کھوکھے نظر آئے۔البتہ ایک کمرہ کافی آراستہ تھا، جس میں ایک شاندار مسہری کے علاوہ ایک میز، دو صوفے اور چند کرسیاں تھیں۔میز کی درازیں باقی تو خالی تھیں، صرف دو میں تالا پڑا تھا۔خان نے انھیں طاقت سے توڑ کر باہر نکال لیا۔وہ چونک پڑا۔یہاں چند سگار ایک کھلے ڈبے میں پڑے تھے، جو بالکل ویسے ہی تھے جیسے چند گھنٹے پہلے سطوت مرزا نے اسے پیش کیے تھے۔اسنے ای کسگار جیب میں ڈال لیا۔پھر وہ اس میں پڑے ہوئے دوسرے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔اچانک کوئی چیز اس کے ہاتھ لگی جسے اس نے باہر کھینچ لیا۔ یہ کسی کا تار تھا جو عجیب سے پتے پر آیا تھا۔انگریزی میں لکھا تھا، اسٹیوارٹ، ورجن کا میج، خلد آباد۔مال فوراً بھیجو۔ایجنٹ نمبر ۷ پارک ایونیو، کلکتہ..... "شوکارڈ"۔

خان نے تار احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔

"صاحب، ایک کمرے سے تو کیسے ایسی بو آرہی ہے۔" ایک سپاہی نے آکر ڈی آئی جی کو سلام کر کے بتایا۔

"چلو دیکھیں تو۔" وہ دوڑ پڑے۔خان بھی ساتھ گیا۔واقعی ان میں سے ایک کمرے سے جیسے خون کی بو آرہی تھی۔یہ بو زمین سے آرہی تھی، جو پختہ نہ تھی، بلکہ اس پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تازہ مٹی ڈال دی گئی ہو۔پولیس نے اسی وقت سنگینوں کی مدد سے زمین کھود ڈالی۔اس میں جگہ جگہ ایسے چھوٹے چھوٹے گڑھے نکلے جن میں خون کے جمے ہوئے لوتھڑے پڑے تھے، لیکن ان کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

"معلوم ہوتا ہے وہ درندے اپنا کام کر گئے۔" خان نے کہا۔"اور گھبراہٹ میں یقیناً انھوں نے سب کو مار ڈالا ہوگا، ورنہ ان میں سے بعض کے نامکمل جسم کے ساتھ زندہ رہنے کی بھی توقع تھی۔" خان بولا۔

"یہ کیسے؟" ڈی آئی جی نے حیرت سے پوچھا۔

"آیے، میں بتا دوں۔" یہ کہہ کر وہ اسے ایک طرف لے گیا اور مختصراً اس نے اپنے تمام اندازے بتا ڈالے۔ ڈی آئی جی کا حیرت وجنون سے برا حال ہو گیا۔

"اف، وہ سور کے بچے مجھے مل جائیں تو میں ان کا سرمہ بنا دوں۔" وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولے۔

"سالے زندہ انسانوں کے جسموں کی تجارت کرتے ہیں۔"

"جسموں کی نہیں، صرف جسموں کے چند حصوں کی۔"

"وہی ہوا، ایک ہی بات ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل آئے۔

"آپ تو مجھے اشارتاً بتا دیجیے، میں ان سالوں کی ہڈیاں پیس دوں گا۔" ڈی آئی جی کا غصہ بڑھتا ہی گیا۔

"کوئی راستہ، کوئی اور نئی بات۔" ایس پی ہمت سنگھ نے سامنے آنے والے سب انسپکٹروں سے پوچھا۔

"بالکل نہیں، صاحب۔" وہ دونوں بولے۔

"ابھی صرف یہ نہیں معلوم کہ جھیل سے کس طرح غائب کر کے یہ لوگ انسانوں کو یہاں لاتے ہیں۔ کاش، دن ہوتا تو میں معلوم کر کے ہی چھوڑتا آج۔" خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"مجرم کہیں بچ کر نکل نہ جائیں۔" ڈی آئی جی نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"گھبرایے نہیں، ان کا گروگھنٹال ہمارے قبضے میں ہے اور وہ بھی کہیں نہیں جا سکتے، لیکن ہمیں اب جلدی چلنا چاہیے، کہیں انھیں خبر نہ ہو گئی ہو۔" یہ کہہ کر خان باہر نکل آیا۔

"کہاں چلنا ہے؟"

"سردست صرف سطوت مرزا کی کوٹھی کو گھیر لیجیے چاروں طرف سے۔" خان نے رائے دی۔ "محاصرہ بہت سخت ہونا چاہیے۔" وہ بولا۔ چنانچہ ڈی آئی جی نے باہر آ کر تمام

Akram Allahabadi

افسروں کو سختی سے بتاتے ہوئے مقام کا محاصرہ کر لینے کی ہدایت کی اور اسی وقت یہ قافلہ چل پڑا۔

سطوت مرزا کا بنگلہ چاروں طرف سے گھیرا جا چکا تھا اور پروگرام کے مطابق شوکت اور اسرار اس وقت بھی سطوت مرزا کو باتوں میں لگائے ہوئے تھے اور وہ پوری طرح مطمئن نظر آ رہا تھا کہ اس وقت سپرنٹنڈنٹ خان، ڈائی آئی جی پولیس اور ایس پی سنگھ بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئے۔

"ارے، معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے صاحب کو ان سالوں نے گرفتار کر لیا ہے۔"

اسرار نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اور خان چل بھی رہا تھا ان دونوں کے بیچ میں، لیکن سطوت مرزا کے چہرے کا رنگ اس وقت متغیر ہونے لگا۔

"بھئی، سطوت میاں، ذرا دیکھیے تو ان لوگوں نے مجھے ایکسیڈنٹ کے جرم میں پکڑ لیا ہے۔ آپ نواب صاحب کو خبر تو کر دیجیے ذرا۔" خان نے بالکل پرانی جیسی شان میں قریب آتے ہوئے اس سے کہا۔

"آپ جانتے ہیں انھیں؟" ایس پی ہمت سنگھ نے سطوت مرزا سے پوچھا۔

"جی... جی ہاں، یہ ہمارے انکل... میرا مطلب ہے میرے انکل کے دوست..." وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ بجلی جیب میں جانے والے اس کے ہاتھ میں سپرنٹنڈنٹ خان نے کھٹ سے ہتھکڑی پہنا دی۔

"یہ... یہ کیا؟"

"یہ وہی ہے جو تم دھندا کرتے رہے تھے، برخوردار۔" خان نے بگڑی ہوئی آواز میں کہا۔

"اسرار، بالے، ابراہیم دیکھو، وہ جو ہا وہاں صفایا کر کرا کے پھر پاگل بن کر اپنے

کمرے میں آ گھسا ہے، بھاگنے نہ پائے۔" خان نے ان تینوں کو آواز دی۔ اور اسی وقت وہ تینوں اندروالے راستے سے پچھلے کمرے کی طرف دوڑ پڑے۔ کچھ دیر بعد ہی اچانک فائرنگ کی ایک آواز سنائی دی۔ پھر دوتین بار پستول کی گولیاں چلیں اور پھر سناٹا چھا گیا۔

پانچ منٹ بعد ہی وہ تینوں بجائے اندر کی طرف سے آنے کے باہر کے دروازے سے ایک آدمی کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش ہاتھ پیروں سے تھام کر لٹکائے اندر لے آئے اور ڈی آئی جی کے سامنے ڈال دیا۔

"ارے، اس پاگل آدمی کو تو میں نے نواب خرم کے یہاں دعوت میں دیکھا تھا"

ڈی آئی جی چونک کر بولا۔

"اور نواب خرم کو بھی دیکھ لیجیے۔" خان نے سطوت کے منہ پر ایک زور کا طمانچہ مار کر کہا۔ "اندر اس کا میک اپ روم ہے جو میں نے ایک دن اس کے یہاں دعوت کھاتے وقت محض لیٹرین تک جا کر دیکھا تھا اور ایک میک اپ روم نواب خرم کی قیام گاہ میں ہوگا۔ اور یہ پاگل بوڑھا اس کا چچا نہیں بلکہ اس کا خاص شریکِ کار تھا۔ بھوتیا جھیل سے آدمیوں کو غائب کرنے اور اور انھیں کلکتہ کی ایک ایکسپورٹ امپورٹ فرم کو جوٹ کے بوروں میں سپلائی کرنے کا کام اس کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ ادھر پاگل بن کر یہ باہر کی دنیا کی خبریں بھی لیا کرتا تھا۔

"اس کمبخت نے تو ایک بار اسی پاگل پن میں خان صاحب کو مار ڈالنے کی بھی کوشش کی تھی، لیکن یہ اور اس کا ساتھی پھر دھوکا کھا گئے۔" بالے بول پڑا۔

"مگر جھیل سے کیسے غائب کرتے تھے یہ لوگ؟" ڈی آئی جی نے پوچھا۔

"میں دن کے وقت بتا سکوں گا۔" خان نے کہا۔ ویسے اب ہمیں گمشدہ لوگوں کو زندہ واپس پانے کی امید چھوڑ دینی چاہیے۔ یہ لوگ انھیں ہماری نگرانی کی وجہ سے باہر نہیں بھیج سکے، اس لیے مجبور ہو کر انھوں نے خود ان کا مطلوبہ اعضا یہیں سے نکال کر بھیج دیے ہوں گے۔" خان نے بتا۔

سطوت مرزا سر جھکائے سب کچھ سن رہا تھا۔ اس کی نظریں اس وقت اپنے ساتھی کے انجام پر لگی تھیں۔

"اعضاء؟"

"جی ہاں۔ ٦ آنکھیں، ٦ اینٹھے اور لیور اور نہ جانے کیا کیا۔" خان نے بتایا۔

"یہ سب آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" ڈی آئی جی نے پوچھا۔

"اس دن ٹیلی فون پر یہ بیٹے اپنے چچا سے یہی آرڈر وصول فرما رہے تھے۔" خان نے ایک اور طمانچہ اس کے منہ پر اتنی زور سے مارا کہ اس کے منہ سے خون نکل پڑا۔

"سالا اتنا درندہ ہے یہ؟" ڈی آئی جی کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے بڑی زور سے اس کی کمر پر گھونسا جما دیا۔ سطوت کی چیخ نکل گئی۔

"اور اس کے باقی ساتھی؟"

"وہ اس وقت ڈر کی وجہ سے سب نواب صاحب کی ڈیری کے طویلے میں چھپے ہوئے ہیں۔ بالے نے ڈیری والوں کو سمجھا سکھا دیا تھا کہ وہ ان سے روپے لے کر انھیں پناہ دے دیں۔ وہ تو ہم اگر کافی لوگ ہوتے یا ہمیں اس علاقے میں خود اقدام کرنے کا حق ہوتا تو شاید اسی وقت ان سے نپٹ لیتے۔" خان نے کہا۔

"تو آپ نے پہلے سے ہمیں ہی بتا دیا ہوتا۔" ڈی آئی جی نے شکایتاً کہا۔

"پہلے تو تحقیق کر رہے تھے ہم لوگ۔ آج ہی ان کے اس اڈے کا پتا چلا ہے۔" خان نے بتایا۔

"آپ فوراً جا کر ان حرامزادوں کو گرفتار کر لیجیے۔ بالے صاحب کو ساتھ لے جایے۔" ڈی آئی جی نے ایس پی ہمت سنگھ کو حکم دیا۔

"بہتر ہے۔" وہ اسی وقت یہ کہہ کر بالے کا ہاتھ تھامے وہاں سے چل دیے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

جھیل کاراز

یہاں یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہاں نواب صاحب کے یہاں کسی کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ پولیس تمام آدمیوں کو، حتا کہ سطوت مرزا کے گھر کے نوکروں کو بھی گرفتار کر کے لے گئی۔ راتوں رات ہی ان گرفتاریوں کی خبر سارے شہر کو ہوگئی۔ حتا کہ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ باہر سے کوئی بڑا جاسوسی افسر آیا ہوا ہے۔ اس نے سب کی مشکیں بندھوادیں۔ لوگ طرح طرح کے تذکرے پھیلانے لگے۔

مگر اس رات کی صبح بڑی قیامت خیز ہوئی، جب سارے شہر میں یہ خبر پھیلی کہ بھوتیا جھیل میں لاشیں ہی لاشیں تیر رہی ہیں۔ پولیس سویرے سویرے ہی دوڑ پڑی۔ ادھر سے سپرنٹنڈنٹ خان، بالے، اسرار اور ابراہیم کے علاوہ لانگ فیلو اور شوکت مرزا بھی آپہنچے اور بھوتیا جھیل کے کنارے خلقت کا ایک ہجوم ہوگیا۔ جھیل کے پانی پر پندرہ سولہ لاشیں تیر رہی تھیں اور ان کی ہیئت عجیب تھی۔ کسی کی آنکھیں غائب، کسی کے پھیپھڑے کٹے ہوئے، کسی کا پیٹ صاف، کسی کا چہرہ اور نیچے کا حصہ بگڑا ہوا۔ یہ بھیانک منظر لوگوں سے دیکھا نہ جاتا تھا اور پھر بھی دیکھ رہے تھے۔ وہ جس قدر اس منظر سے متاثر ہوتے جاتے اسی قدر اس کے گرفتار شدہ مجرموں کے خلاف ان کا غم وغصہ بڑھتا جاتا۔ ان لاشوں کو بہر طور جھیل سے نکلوا کر اسٹریچروں کے ذریعے ایمبولینس گاڑیوں میں ڈلوا کر روانہ کر دیا گیا۔ ۱۰ بجے دن تک واٹر ورکس سے پانی کھینچ کر پھینکنے والے پمپ اور مزدور آگئے اور جھیل کا پانی نالیاں کاٹ کاٹ کر بہایا جانے لگا۔ وہ تمام دن جھیل سے پانی خالی کیا جاتا رہا۔ میونسپل کے تمام آب بردار ٹرک اس کام میں لگا دیے گئے تھے اور شام تک نصف جھیل خالی ہوسکی۔

اسی دوران میں پولیس نے اپنا کیس مکمل کرلیا۔ خان کے سامنے ہی بالآخر تھرڈ

ڈگری کی تاب نہ لا کر سطوت مرزا اور اس کے ساتھیوں نے سب کچھ قبول کرلیا۔ خان کے تمام اندازے صحیح نکلے۔ یہ صرف پندرہ آدمیوں پر مشتمل گروہ، جس کا اصل سرغنہ خود پاگل بوڑھا تھا، جس کا اصل نام ڈاکٹر یزدی تھا۔ وہ نسلاً ایرانی اور اپنی زندگی میں ایک ناکام معالج تھا۔ اس نے بآسانی دولت مند بننے کے یہ ڈھنگ نکالے تھے۔ اس کے لیے اس نے سطوت مرزا کو، جو پہلے ہی خراب سوسائٹی کا فرد بن چکا تھا، اور جس نے اپنی تمام دولت جوجوٹ کی نذر کردی تھی، ملا لیا تھا۔ سطوت مرزا ہی اسی یون چکی اور اس علاقے کا مالک تھا اور اس نے ہی نواب خرم بن کر خود کو دونوں طرف سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کاروبار کے معاملات دیوالیہ انشورنس کمپنی کی بلڈنگ میں طے کرنا شروع کیے تھے۔ خود کو پبلک میں نیک نام اور اچھا ثابت کرنے کے لیے اس نے سادہ لوح جرنلسٹ لانگ فیلو سے دوستی کر کے اپنی نیکیوں اور قومی ہمدردیوں کا پراپیگنڈہ کروایا تھا۔ سطوت مرزا نے ہی یہ اقبال کیا کہ پورے ایک زندہ جسم کے مختلف اعضا کے سیٹ کی قیمت کم از کم دس ہزار لیتے تھے۔ ان اعضا میں آنکھیں، گردے، غدود، بعض اوقات پھیپھڑے اور دل اور بعض دوسرے حسبِ ضرورت حصے شامل تھے اور ان سے یہ خریداری کلکتہ کی ایک شاخ کے ذریعے جاپان کا ایک پرائیوٹ سرجیکل اسپتال کرتا تھا، جو اپنے گاہکوں سے اس سے بھی چوگنی قیمت وصول کرتا ہوگا۔ یہ اعضا دولت مند مریضوں کے بیکار اعضا کی جگہ آپریشن کے ذریعے لگائے جاتے تھے اور ان ڈاکٹروں کا یہ طریق کارکامیاب تھا۔

اس بھیانک روئداد نے پولیس والوں کے بھی رونگٹے کھڑے کردیے۔ ڈی آئی جی اور پولیس کمشنر نے رپورٹ میں عدالت سے سفارش کی کہ ان مجرموں کو ایسی عبرتناک اور سخت ترین سزا دی جائے جو ساری دنیا کے لیے مثال ہو، لیکن ظاہر ہے کہ سزائے موت سے زیادہ کیا ہو سکتی تھی۔ سطوت مرزا نے بہرحال جھیل سے آدمیوں کے غائب ہونے کا طریقہ کار نہیں بتایا، وہ کہتا تھا کہ اسے صرف ڈاکٹر یزدی جانتا تھا۔

اسی دن دوپہر کو روف بھی تارپا کر آ پہنچا۔ خان نے اسے اسی وقت خلدآباد پولیس

Akram Allahabadi

کے ایک سب انسپکٹر اور ابراہیم کی معیت میں کلکتہ روانہ کردیا۔ کیونکہ رؤف سے بہتر کلکتہ کو کون جانتا۔ پون چکی والی عمارت کے کمرے میں میز کی دراز سے ملنے والے تار میں دیا ہوا پتا رؤف کو خان نے سمجھا دیا تھا۔ یہ لوگ یہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے کلکتہ چل دیے۔ اور وہ رات خلد آباد کے تمام پولیس افسروں نے سکون سے گزاری۔

☆☆☆☆☆☆

دوسرے دن سویرے سے پھر جھیل کا پانی نکالا جانے لگا اور سہ پہر کو چار بجے تک اس کی تہ میں کیچڑ نظر آنے لگی۔ خان اور خلد آباد کے دوسرے پولیس افسر معہ اپنے کمشنر کے اس کیچڑ میں اتر گئے، جو زیادہ گہری نہ تھی۔ عین اس گرداب کی جگہ پہنچ کر جب زمین صاف کرائی گئی تو انھیں کائی کے کھرچے جانے کے بعد ایک تقریباً ۱۰ فٹ کے گول دائرے کا نشان نظر آیا۔ یہ ۴۰۔۵۰ فٹ قطر کا ایک گول چپٹا تو امعلوم ہوتا تھا۔

"ضرور یہ جگہ اندر سے کسی کنوئیں کی طرح ہوگی اور یہ تو ضرور تیزی سے گردش کرتا ہوا اندر بیٹھتا ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی جھیل کا پانی اور گرداب میں آئے ہوئے آدمی اور کشتی وغیرہ بھی۔ اور جب یہ نیچے پہنچ جاتے ہوں گے تو اس کنوئیں کا منہ کسی دوسری میکینکل چادر سے بند کردیا جاتا ہوگا، جس کے بعد نیچے کا پانی زمین دوز نالیوں سے خارج کر کے ڈوبنے والوں اور کشتی وغیرہ کو کسی قسم کے دروازوں یا کھڑکیوں سے نکال لیا جاتا ہوگا جس سے اس توے کے اوپر آنے پر اوپر ڈھکی ہوئی چادر ہٹ جاتی ہو اور منہ بند ہو جاتا ہو۔" خان نے بغور اس جگہ کا مطالعہ کرنے کے بعد رائے دی۔ ساتھ ہی وہ اس دائرے کے آس پاس کی زمین ایک سپاہی کی بندوق کے کندے سے ٹھوکنے لگا۔ اندر سے لوہے جیسی ٹھنک سنائی دینے پر کمشنر اور ڈی آئی جی چونک پڑے۔

"بالکل یہی معاملہ ہے۔" ڈی آئی جی نے کہا اور کمشنر نے بھی تائید کی۔

"لیکن جھیل کی تہ میں یہ میکانیکل سسٹم بنایا کیسے گیا؟" کمشنر نے پوچھا۔

"یہ میں بتاتا ہوں۔" پیچھے آئے ہوئے مجمع میں سے ایک شریف صورت بوڑھا آدمی آگے بڑھ گیا۔

"میں پی ڈبلیو ڈی کا ہیڈ ڈرافٹ مین ہوں۔ آج میں نے اخباروں میں صبح اس جھیل کے بارے میں ان حیرت انگیز انکشافات کی خبریں پڑھ کر جب جھیل کا پرانا نقشہ تعمیرات کی فہرست پر ڈھونڈا تو اس میں سے یہ چارٹ نکلا۔" بیس سال پہلے جب اس جھیل کا پانی امل کر بستی میں پھیل گیا تھا، اسی موسمِ گرما میں پانی خشک ہونے پر اسے خالی کرایا گیا تھا اور اس زمانے کے ایک انگریز انجینئر نے ہی یہ میکانیکل سسٹم نیچے بنوایا تھا تاکہ جھیل جب چھلک اٹھے تو پانی کی نکاسی زمین دوز نالیوں سے ہو سکے۔" بوڑھے نے بتایا۔

"ارے..." وہ سب اس انکشاف پر چونک پڑے۔ "اور یہ کسی کو معلوم نہیں؟" کمشنر نے کہا۔

"اس کے استعمال کی آج تک ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی شاید۔" بوڑھا بولا۔

"تو پھر اس ڈاکٹر کے بچے کو ضرور یہ چیز معلوم رہی ہوگی۔ اس نے اسی سے فائدہ اٹھایا۔" ڈی آئی جی بولے۔

"لیکن اسے چلایا کہاں سے جاتا ہوگا؟" کمشنر نے پھر پوچھا۔

"اس کی نالیاں، جھیل کے مشرق میں ایک بلند ٹیلے سے..." بوڑھا چارٹ دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر وہ مشرق میں کھڑے ہوئے ٹیلے کو دیکھ کر تصدیق کرنے لگا۔

"ہاں، اس ٹیلے کے نیچے سے ایک سرنگ کے ساتھ نکالی گئی ہیں اور اسی سرنگ سے دو موٹے تار گزر رہے ہیں جو ٹیلے کے پیچھے کسی عمارت میں گئے ہوئے کسی وہیل (پہیے) میں نصب ہیں۔" بوڑھا بتانے لگا۔

"وہیل...؟ اوہ... تو وہ چکی کا پنکھا ہوگا پھر۔" خان نے چونک کر کہا۔ "تب ہی تو وہ

اتنا سخت تھا۔“

”عجیب واقعات ہیں یہ بھی۔“ کمشنر نے سوچ کر اظہار حیرت کرنے لگا۔

”آپ اسے جلد از جلد سرکاری چارج میں لے لیجیے تو بہتر ہے۔“ ڈی آئی جی نے کمشنر سے گویا درخواست کی اور وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

فولادی قبر

اسی شام کو پون چکی اور اس کی عمارت پر ایک ہنگامی حکم کے ذریعے سرکاری قبضہ کرلیا گیا۔ سرکاری حکام اور پولیس کے بڑے بڑے عہدیدار سب نے اس پانی کی زمین دوز نالیوں والے میکانیکل سسٹم کا معائنہ کیا۔ اسی وقت میکانیکل انجینئر بھی بلوا لیے گئے تھے اور جب ایک انجینئر نے کار سے پون چکی پر جا کر پنکھے کے ذریعے اس مشین کو چلایا تو یہاں تمام لوگ بوڑھے ہیڈ ڈرافٹ مین کے بیان کی تصدیق عملی شکل میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ خان کے بیان کردہ اندازے کے مطابق جھیل کے درمیان میں وہ فولادی دائرے بغیر کسی آواز کیے تیزی سے گھومنا شروع ہو گیا اور پھر آہستہ آہستہ نیچے کی طرف دھنے لگا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد وہ تقریباً ۲۵۔۳۰ فٹ نیچے جا کر تھم گیا۔ اندر سے کچھ عجیب سی بدبو کے بھبکے اڑتے ہوئے نکلے اور لوگ پیچھے ہٹ گئے۔

”چلو، اترو اندر۔“ خان نے بالے کو آگے دھکیلا۔

”مم... مم... میں؟“ وہ پیچھے کی طرف لڑھکتے ہوئے تقریباً چیخ اٹھا۔ ”میں جیتے جی اس فولادی قبر میں نہیں اتروں گا۔“

”میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ گڑبڑ کی تو گردن تھام کر لڑھکا دوں گا۔“ خان اسے کالر سے تھامے اس کنوئیں کے قریب لے آیا۔

”تم اکیلے ہی نہیں ہو اور بھی لوگ جا رہے ہیں ساتھ۔“ ڈی آئی جی نے کہا۔

”اگر میں شہید ہو گا تو آپ میرا فاتحہ کریں گے نا؟“ بالے نے رک کر روتی صورت بناتے ہوئے خان سے پوچھا۔

”تم جاؤ نا، میں تمہاری آنے والی سات نسلوں پر بھی فاتحہ پڑھ دوں گا۔“

چنانچہ اسی وقت ایک فولڈنگ سیڑھی اندر اتار دی گئی اور بالے اور دوسرے دو سن انسپکٹروں کے ساتھ جو ٹارچز ہاتھوں میں لیے تھے اندر اتر گیا۔ اس کنوئیں کی اندرونی دیواریں سب فولادی تھیں، جس طرح کوئی میٹروں کی ٹنکی اندر اوندھی گاڑ دی گئی ہو۔ اس میں سے آپ سے آپ یا شاید باہر سے نکلنے والی چھوٹی چھوٹی دو کھڑکیاں اور کئی ڈرین ہول تھے، جن کے ڈھکن چپکے ہوئے تھے۔ ان کھڑکیوں کو کھولنے کی انھوں نے بہت کوشش کی، لیکن وہ نہ کھلیں اور کھلیں تو اچانک دروازہ اور دونوں کھڑکیاں ایک ساتھ کھل گئیں اور بدبودار گٹروں کی ملی جلی بساند ان کی ناکیں سڑانے لگیں۔

کھلنے والی کھڑکیوں اور دروازے سے اندر روشنی کا بہت مدھم انعکاس شروع ہو گیا۔ بہرحال ٹارچز کی مدد کے بغیر وہ باہر نہ نکل سکے۔ باہر قدم رکھنے پر ان کے پیر ہلکی ہلکی کیچڑ میں پھنس گئے، جس کے نیچے زمین سخت اور پتھریلی تھی۔ بیٹریوں کی مدد سے وہ آگے بڑھنے لگے۔ یہ پتلی پتلی نالیاں تھیں جو ایک زمین دوز ٹنل سے گزر رہی تھیں۔ اس کا کٹاؤ اتنا وسیع تھا کہ با آسانی بیک وقت تین آدمی کھڑے ہو کر اس میں سے گزر سکتے تھے۔ وہ کافی دیر محتاط قدموں سے اس زمین دوز راستے میں چلتے رہے، جس میں سے ان کے ساتھ ہی ساتھ پانچ نالیاں بھی بہہ رہی تھیں۔ کافی آگے جا کر ان میں سے دو نالیاں دو مختلف سمتوں کو دو بڑے سوراخوں میں گھوم گئی تھیں۔ باقی تین اور چوڑی ہو کر آگے چلی گئی تھیں۔ پھر انھیں کچھ کچھ روشنی سامنے کی طرف سے آنے لگی۔ دور سے اس ٹنل کا مخرج چھوٹا نظر آ رہا تھا، مگر قریب پہنچ کر وہ کافی بڑا معلوم ہونے لگا۔ اس سے باہر نکلنے پر ان کے جسموں سے تازہ ہوا کے جھونکے ٹکرائے۔ وہ اب اسی اینٹوں کی پرانی عمارت میں تھے، جس سے پون چکی منسلک تھی۔ یہیں پون چکی پر میکانیکل انجینئر سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ دوسری طرف سے گھوم کر کچھ پولیس آفیسر اور آ گئے اور وائرلیس کے ذریعے یہاں سے جھیل پر موجود ڈی آئی جی اور سپرنٹنڈنٹ خان کو مطلع کر دیا گیا کہ ہم لوگ اس طرف سلامتی سے آ پہنچے ہیں اور ٹنل میں کوئی مشتبہ چیز نہیں ملی،

Akram Allahabadi

سوائے ایک خاص قسم کی سڑاند کے، جو غالباً ان نالیوں کی وجہ سے تھی۔ انسانیت کی اس قتل گاہ کے باقی حصے پہلے ہی دیکھے جا چکے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

کلکتہ میں

پارک اسٹریٹ کے ایک اوسط درجے کے ہوٹل 'سونتز' کے ایک کمرے میں صبح صبح رؤف کی آنکھ کھلی تو ٹیبل ٹائم پیس میں ساڑھے 7 بج چکے تھے۔ کل شام ہی اسے ٹرنک کال پر سپرنٹنڈنٹ خان کی ہدایت مل چکی تھی کہ بلا تاخیر 'شو کارڈ' کا پتا چلا کر فوراً چھاپا مارو، لیکن رات اس کی کوششوں کے باوجود اسے محکمہ سول سپلائز کا وہ انسپکٹر نہ مل سکا جس نے اسے ایک ملاقات میں اتنا ہی بتایا تھا کہ اس نام کی کوئی فرم کولوٹولہ کے علاقے میں موجود ہے جو ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس کرتی ہے۔ اور تب سے وہ کولوٹولہ کے پورے علاقے کو چھان چکا تھا، لیکن شو کارڈ کا نہ کہیں کوئی بورڈ اسے نظر آیا نہ وہ اتنی مشہور کوئی فرم تھی کہ عام لوگ اس کے جائے وقوع سے واقف ہوں۔

رات اسی لا حاصل محنت کے بعد وہ دیر سے بستر پر لیٹا اور اسی وجہ سے آج دیر سے سو کر اٹھا۔ ہوٹل کا بیرہ جو اپنے ہوٹل کے اس نئے مہمان کے دروازے پر صبح سے دوبار گھنٹیاں بجا کر واپس لوٹ چکا تھا، اسے جاگا ہوا پا کر ناشتا لے آیا اور آدھ گھنٹے میں وہ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد لباس تبدیل کر کے ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔

کلکتہ جیسی عظیم آبادی میں ایسی گمنام فرموں کا پتا چلا لینا، یا محض انجانی مشتبہ شخصیتوں کو ڈھونڈ نکالنا کوئی بچوں کا کھیل نہ تھا۔ کنٹرولر آف امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس کے دفتر سے ہی اب ایک آخری امید وابستہ تھی، لیکن خان رؤف کو پہلے ہی ہدایت کر چکا تھا کہ جب تک یقینی طور پر اس مقام کا سراغ نہ لگا لیا جائے، سوائے پولیس کے اعلا افسروں کے، اور کسی پر اعتماد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اسی وجہ سے ابھی تک رؤف نے اس دفتر سے بھی براہِ راست اس فرم کا پتا نہیں مانگا تھا۔ اس انسپکٹر سے بھی اس کی ملاقات اس دفتر کے کینٹین میں ہو گئی تھی،

Akram Allahabadi

جہاں فرصت کے وقت اسی محکمے کے کچھ لوگ بیٹھے پلے کارڈز کی اچھی بری قسموں پر گفتگو کر رہے تھے اور اسی میں رؤف نے اجنبی ہونے کے باوجود'شو کارڈ' کا بھی تذکرہ ٹھونک دیا تھا، جس پر اس انسپکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے بتایا تھا کہ ہاں اس نام کی بھی ایک فرم ہے شاید۔ اور اس کے بعد وہ وہ اپنے کسی سرکاری کام کے سلسلے میں رؤف کی نظروں سے ایسا اوجھل ہوا کہ پھر ملا ہی نہیں۔

اس کا رخ اس وقت پھر کولوٹولہ اسٹریٹ کی طرف تھا۔ اس نے آج فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر آج بھی پتا نہ چل سکا تو پھر وہ اپنی سرکاری حیثیت میں اس محکمے کے کسی ذمے دار افسر سے مل کر شو کارڈ کا پتا حاصل کرے گا۔ آج اس کا پروگرام عمارتوں کی بالائی منزلوں پر اس کمپنی کے بورڈ یا دفتر کو تلاش کرنے کا تھا۔ اپنی بڑی بڑی مونچھوں اور بھاری جسامت کے ساتھ اس نے اس وقت ہندوستان میں مدت سے آکر بسے ہوئے کسی کابلی پٹھان کا لباس پہن رکھا تھا جو ایک ترکش کوٹ، قمیض اور شلوار کے علاوہ سر پر بندھی ہوئی کلاہ اور پگڑی پر مشتمل تھا۔ وہ اس حلیے میں قطعی ایک سود خور پٹھان معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چمکیلی عقابی نظریں دو طرفہ عمارتوں کی بالائی منزلوں کی کھڑکیوں اور چھجوں پر لگی تھیں اور قدم سڑک پر اٹھ رہے تھے، اتنے میں ایک رکشا والا اس سے ٹکرا گیا۔

"خوچلغوزے کا بچی۔" رؤف اس پر بگڑ گیا۔ "تم دیکھ کر نہیں چلتی۔"

"خان... شاب... توم... کھد جمین (زمین) دیکھ کر نہیں چلتا۔ ام کو کاے کو ڈانٹا۔" بنگالی رکشا والے نے اس کے غصے کے خلاف بگڑی ہوئی اردو میں احتجاج کیا۔

"اوے رکشا والی، ہتم پروردگار کا تم غریب آدمی اس لیے ام تم پر غضب نہیں کرتی۔ جاؤ، جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اور رکشا والا اپنی بنگالی زبان میں اسے نہ جانے کون کون سی بددعائیں دیتا ہوا اپنی راہ ہو لیا۔

"اوبائی، اوبائی۔" رؤف نے فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے ایک آدمی کو ٹوکا۔

Akram Allahabadi

"وہاٹ؟" وہ بگڑ کر بولا۔ "تم ام کو بائی بولتا۔ تو م کو شورم نا ئیں آ تا۔ بائی لوگ کون ہوتا۔" وہ رؤف سے ہی پوچھنے لگا۔

"خو، اللہ قسم ام تم کو برادر بولا۔ برادر یعنی کہ بائی۔" رؤف اسے سمجھانے لگا۔

"اچھا، بولو بولو، کیا بولتا تم؟" بنگالی راہ گیر نے کہا۔

"ادھر کوئی امپورٹ اکسپورٹ کی کمپنی ہوتی۔" رؤف نے اس سے سوال کیا۔

جس پر وہ سر سے پیر تک اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ اور پھر کوئی جواب نہ دے سکا۔ شاید وہ اس پٹھان کی صحیح الدماغ ہونے پر شبہ کر رہا تھا۔

اچانک وہ چلتے چلتے چونک پڑا۔ ایک اوسط درجے کے سڑک چھاپ ہوٹل سے ملے ہوئے کسی بلڈنگ کے دروازے سے وہ انسپکٹر اسے نکلتا نظر آیا جو اس ون امپورٹ ایکسپورٹ کنٹرولر کے دفتر کے کینٹین میں شو کارڈ کا ذکر کر چکا تھا۔ رؤف اسے دیکھتے ہی اس کے پیچھے دوڑنا چاہتا تھا کہ اتفاقاً اس کی نظر اوپر کی طرف اٹھ گئی۔ اسی عمارت کی دوسری منزل پر ایک کھڑکی کے اوپر کی سمت میں ایک چھوٹا سا بورڈ لٹکا نظر آ رہا تھا، جس پر لکھا تھا 'شو کارڈ'۔ رؤف یہ دیکھتے ہی چونک پڑا اور اب خود کو اس انسپکٹر کی نظروں سے بچاتا ہوا اسی ہوٹل میں گھس گیا۔ جب وہ دو منٹ بعد وہاں سے زبردستی ایک پیالی چائے پی کر باہر نکلا تو سڑک صاف تھی اور انسپکٹر حدِ نظر سے دور جا چکا تھا۔ وہ جلدی سے اس عمارت کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ شاید اس کی لفٹ بگڑی ہوئی تھی اور رؤف نے اسکی پرواہ بھی نہ کی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا دوسری منزل پر جا پہنچا اور یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگی کہ وہ فلیٹ، جس پر شو کارڈ کی تختی لٹک رہی تھی، بند نہ تھا۔ اس کے اندر آدمی موجود تھے اور ٹائپ مشین چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ الٹے قدموں لوٹ پڑا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ ام یہ کدھر داخل ہو گئی کمبخت۔" وہ سیڑھیوں پر پاس سے گزرنے والے ایک دوسرے آدمی کو سنانے کے لیے بڑبڑایا۔ مگر وہ آدمی اسے اب بھی غور سے دیکھ رہا

Akram Allahabadi

تھا۔حلیے سے وہ کسی دفتر کا نوجوان کلرک معلوم ہوتا تھا۔

"کیا ہے، خان؟" وہ پوچھ ہی بیٹھا۔

"اوئے اس کلکتہ میں کیا نہیں ہے، وہ نہیں ہے تو کمبخت لیمنگٹن کمپنی کا دفتر۔"

"لیمنگٹن کمپنی؟" وہ آدمی خان کی شکل سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"وہ مشین کا کمپنی ہے، برادر۔ پٹ، پٹ مشین کا۔خدا کی قدرت انگلی ایسا مارو تو حروف بنتی ہے۔" رؤف نے اس کے سینے پر انگلی مار کر کہا۔

"اوہ، ریمنگٹن بولو، خان، ریمنگٹن۔" اس آدمی نے ہنستے ہنستے کہا۔

"امارا نام ولی داد خان ولد خوب داد خان کابلی ہوتی، برادر۔تم ریمنگٹن خان کس کو بولتی۔" رؤف نے برا ماننے والے انداز میں جواب دیا۔

"نہیں نہیں، ہمارا مطلب ہے کہ اس کمپنی کا نام ریمنگٹن ہے۔اس کا دفتر آگے والی بلڈنگ میں ہے۔" اس نے بتایا۔

"اوئے، بہت بہت شکریہ تمہارا۔پروردگار تم کو صاحب اولاد کرے۔" رؤف اسے دعائیں دیتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔

سڑک پر آتے ہی وہ تیزی سے ہوٹل کے پیچھے کی طرف دوڑا اور ایک پتلی سی گلی سے گزر کر دوسری طرف کی چوڑی سڑک پر نکلتے ہی اس نے ٹیکسی پکڑی۔

"ڈرائیور صاحب، ام کو پولیس کا بڑا دفتر لے چلو۔سالا امارے بائی کورٹ پار کا حکم دے دیا۔ام اس کو بچائے گا۔" وہ ڈرائیور سے بولا۔ڈرائیور سمجھ گیا کہ وہ پولیس ہیڈ کوارٹرز جانا چاہتا ہے۔اس نے گاڑی کا رخ پولیس ہیڈ کوارٹرز کی طرف کر دیا۔

چند منٹ بعد وہ اسی خان کے بھیس میں کلکتہ کے انسپکٹر جنرل آف پولیس مسٹر آنند کمار کے سامنے اٹینشن کھڑا تھا۔

"مجھے آئی جی خلد آباد کی معرفت سپرنٹنڈنٹ خان کا پیغام مل چکا ہے۔میں ایس پی

مہندر سنگھ کو ابھی حکم دیے دیتا ہوں۔آپ چاہیں تو فوراً چھاپا مار سکتے ہیں۔" آئی جی نے کہا۔

"بہتر ہے، حضور۔جس قدر جلد ممکن ہو انھیں گھیر لینا چاہیے۔" رؤف نے مؤدب لہجے میں کہا۔

"آپ سنٹرل پولیس اسٹیشن سٹی ایریا پہنچ جایے۔اس سے پہلے میں یہاں سے ایس پی صاحب کو فون کردوں گا۔" آئی جی نے کہا۔اور رؤف رخصتی سلام کر کے باہر نکل آیا۔

ٹیکسی ابھی تک باہر موجود تھی۔پولیس ہیڈ کوارٹرز سے سنٹرل پولیس اسٹیشن سٹی ایریا پہنچنے میں آدھ گھنٹہ لگ گیا۔لیکن جس وقت وہ ایس پی مہندر سنگھ کے سامنے پیش ہوا، انھیں آئی جی کی طرف سے ہدایت مل چکی تھی۔

"چھاپا ابھی مارنا چاہیے کیا؟" ایس پی نے پوچھا۔

"بہتر یہی ہے، ممکن ہے خلد آباد سے ان کا کوئی آدمی انھیں اطلاع دے دے اور وہ لوگ زمین دوز ہو جائیں۔" رؤف نے کہا۔

"تو پھر چلیے۔" ایس پی اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا۔اس نے ایک سب انسپکٹر اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو معہ آٹھ مسلح کانسٹیبلوں کے پولیس ویگن میں بیٹھ کر پیچھے آنے کا حکم دیا اور رؤف کو اپنی کار میں بٹھا کر چل پڑا۔

کولوٹولا اسٹریٹ میں اچانک اس بلڈنگ کا جب پولیس نے محاصرہ کیا تو ہوٹل کے آدمی اور راہ چلتے بھی تماشا دیکھنے تھم گئے۔اور علاقے میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔باہر آدمی نگرانی پر لگا کر ایس پی مہندر سنگھ، رؤف اور سب انسپکٹر اور دو سپاہیوں کو لیے اوپر چڑھ گئے۔

شو کارڈ کے دفاتر اندر سے تین بڑے کمروں پر مشتمل تھے، جن میں سے ایک شاید گودام کا کام دیتا تھا اور ایک میں کلرک وغیرہ بیٹھے تھے۔باقی ایک کمرے میں کاغذات کی الماریاں اور دوسری معمولی چیزیں پڑی تھیں۔

پولیس کے اچانک اندر داخل ہوتے ہی اندر بیٹھے ہوئے لوگ چونک پڑے۔ان

Akram Allahabadi

کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔وہ تین آدمی تھے۔اس دفتر کا ایک چپراسی بھی تھا، جو اس وقت کہیں گیا ہوا تھا۔

ایس پی نے ان تینوں کو سب انسپکٹر کے حوالے کر کے خود رؤف کے ساتھ اس جگہ کی تلاشی لینی شروع کر دی۔چنانچہ دوسرے کمرے سے ایسے کچھ بورے اور پیکج مل گئے جو خلد آباد سے بھیجے گئے تھے۔کاغذات سے ان کے مفید مطلب کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔اس کے بعد اس کمرے میں واپس آ کر ایس پی نے ان سے سوالات شروع کر دیے اور بالآخر ان دونوں نے قبول کر لیا کہ وہ اس دفتر وں میں خلد آباد کا مال چھڑانے اور اوور سیز بکنگ کے کام کے ذمے دار ہیں۔

"تمہارا باس کون ہے۔" ایس پی نے پوچھا۔

"یہ ہم خود بھی نہیں جانتے۔ ہمیں صرف ہمارا منیجر آرڈر دیتا ہے۔" ان میں سے ایک نے ڈرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟" رؤف نے پوچھا۔

"وہ یہاں کبھی کبھی آتا ہے۔وہ چورنگی کے علاقے میں کہیں رہتا ہے، لیکن ہمیں اس کا پتا معلوم نہیں۔" اس نے بتایا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ کمپنی کیا کاروبار کرتی ہے؟" ایس پی نے سوال کیا۔

"ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ خلد آباد سے کمپنی کو پٹ سن کی گانٹھیں بھیجی جاتی ہیں جو یہاں سے ہم رتی رام جوٹ ملز کو سپلائی کر دیتے ہیں۔اس کے علاوہ کمپنی کی طرف سے کچھ مال جاپان بھی بھیجا جاتا ہے۔" دوسرے آدمی نے بتایا۔

وہ ان سے اس سے زیادہ نہ معلوم کر سکے۔چنانچہ رؤف کی تجویز پر ایس پی نے ان تینوں گرفتار شدگان کو سنٹرل پولیس اسٹیشن کی حوالات میں بھیج دیا۔دفتر پر سرکاری قبضہ ہو گیا، لیکن اس چپراسی کا پتا نہ چلا جو پولیس کے چھاپا مارنے کے وقت بھی لاپتا تھا۔

Akram Allahabadi

اسی کے ایک گھنٹہ کے بعد جب رؤف نے خان کو ان گرفتاریوں اور ان کے نتائج سے ٹرنک کال پر مطلع کیا تو خلافِ توقع اسے شاباش کے بجائے ٹیڑھا سا جواب ملا۔

''وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔'' خان نے کہا۔ ''یہ معاملات اتنے سیدھے سادے نہیں ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ان پر تھرڈ ڈگری کا استعمال کرو، پھر شاید وہ قبول کریں، ورنہ کسی ایک کو ڈھیل دے کر اس کا تعاقب کرو۔'' خان نے ہدایت کی۔

''میں نے رتی رام طرز سے معلوم کیا تو وہاں واقعی خلد آباد سے بھیجی گئی پٹ سن کی گانٹھیں شوکارڈ کی معرفت پہنچتی ہیں، لیکن ان میں تو صرف پٹ سن ہوتا ہے۔'' رؤف نے بتایا۔

''اب اتنے بھولے نہ بنو، وہ لوگ اتنے بیوقوف نہیں ہیں کہ مال منگانے اور کسی کو سپلائی کرنے کا قانونی مسئلہ چارہ نہ رکھتے ہوں۔ تمہیں انسانی لاشوں کے سوداگروں کو تلاش کرنا ہے، پٹ سن کے بیوپاریوں کو نہیں۔'' خان نے اسے سمجھایا۔

''بہت خوب۔'' رؤف نے کہا۔

گفتگو طویل ہو چکی تھی، اس لیے انھیں ٹرنک کال کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

دوپہر کے کھانے کے بعد رؤف پھر سنٹرل پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس نے خان کی ہدایات سے ایس پی مہندر کو بھی آگاہ کر دیا۔ انھیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انھوں نے رؤف کو اس بات کی اجازت دے دی کہ گرفتار شدگان سے وہ حسبِ ضرورت سختی بازی سے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرلے۔

☆☆☆☆☆☆

رؤف کی بڑی بڑی مونچھوں اور اس کی بھاری جسامت کا جو نفسیاتی اثر ان مجرموں

پر حاوی تھا۔اس میں تھرڈ ڈگری کی اضافت نے انھیں سہارا دیا اور بالآخر ان میں سے دو نے قبول کرلیا کہ انھیں جاپان کے ایک سرجیکل اسپتال کو مال بھیجنے کی ہدایات خلد آباد سے دی جاتی تھیں اور خلد آباد کو جاپان سے یہاں موصول ہونے والے آرڈرز ٹرنک کال یا تار کے ذریعے دے دیے جاتے تھے۔رؤف اس بیان سے مطمئن نہیں ہوا۔اس نے یہ اطمینان کرلینے کے بعد کہ گرفتار شدہ لوگ سنگین مجرم ہیں۔تھرڈ ڈگری کے ایک اور اذیت ناک طریق کار کا عمل ان پر شروع کیا۔یہ طریقہ پہلے کی بہ نسبت کامیاب رہا۔اس بار انھوں نے قبول کیا کہ ان پٹ سن کی گانٹھوں میں خلد آباد سے زندہ جانیں پیک کی جاتی تھیں اور پٹ سن میں ان کی پیکنگ سے ریشوں کے درمیان سے بہر حال ہوا کا اتنا باریک گزر ضرور ہوتا تھا جس سے ان کی جسمانی حیثیت خراب نہ ہو۔ان کے پھیپھڑوں کی حرکت اور سانس جاری رکھنے کے لیے ان کے منہ پر ایک ربڑ کا ٹوپ چڑھا کر اس کی دو باریک نلکیاں اسی پیکنگ میں جوٹ کے ریشوں کے درمیان سے باہر کی طرف نکال دی جاتی تھیں جن سے سانس کی آمدورفت برابر جاری رہتی تھی اور چونکہ پٹ سن کی گانٹھیں دو سائڈ سے کھلی پیک ہوتی تھیں، اس لیے ان پر کسی قسم کا شبہ کیے جانے کا امکان ہی نہیں تھا۔کسی کھلی چیز پر یوں بھی کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

یہ سب کچھ قبول کرلینے کے باوجود وہ یہ نہ بتا سکے کہ خلد آباد سے اس طرح بھیجی جانے والی ان انسانی جانوں کو پھر کہاں بھیجا جاتا تھا اور ان کا کیا کیا جاتا تھا؟ انھوں نے اس سے قطعی لاعلمی ظاہر کی۔وہ صرف یہ بتا سکے کہ منیجر کی ہدایت پر وہ گانٹھیں ایک بند باڈی والے ٹرک میں یہاں سے کہیں بھیج دی جاتی تھیں۔وہ ٹرک کہاں سے آتا تھا اور کہاں جاتا تھا؟ یہ بھی وہ نہیں بتا سکے۔کیونکہ ان کے بیان کے مطابق انھیں یہ جاننے کی اجازت نہ تھی۔

☆☆☆☆☆☆

رؤف نے اس قدر بیان ریکارڈ کرلیا، لیکن اس سے اس کا کام ختم نہیں ہوا۔وہ خان

Akram Allahabadi

کو اس کی رپورٹ دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ کیونکہ سلسلہ دراز ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس پراسرار سلسلے کی آخری کڑی اب تک نامعلوم تھی۔ شو کارڈ کے ان گرفتار شدہ ملزمین کے بیانات بھی کم پراسرار نہ تھے کہ ایک ایسے خطرناک کام میں ملوث ہوتے ہوئے بھی ان کی معلومات خود اس کام کے بارے میں محدود تھیں۔

رؤف کا ذہن تمام تر قوت کے ساتھ یہ سوچ رہا تھا کہ پھر وہ ٹرک کس کا تھا؟ کہاں سے آتا اور کہاں جاتا تھا؟ منیجر کا حلیہ اگرچہ ان لوگوں نے بتا دیا، لیکن کلکتہ جیسے گھنی آبادی والے شہر میں ایک انجانے آدمی کو اس کے حلیے سے ڈھونڈ نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ خصوصاً اس مشکل میں جب کہ اس کا کوئی فوٹو بھی دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ہیر پھیر کر وہ پھر اسی ہوٹل پر پہنچ گیا جو شو کارڈ کمپنی والی عمارت کے نزدیک واقع تھا۔ یہاں اس نے مختلف طریقوں سے ہوٹل میں آنے جانے والوں اور ہوٹل میں کام کرنے والوں سے اس ٹرک کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی، لیکن بے سود۔ پھر بھی اسے یقین تھا کہ اس ہوٹل میں آنے والوں نے کبھی نہ کبھی اس ٹرک کو یہاں اور یہاں کے علاوہ کسی اور علاقے میں دیکھا ہوگا۔

پارک اسٹریٹ ایریا کا ایک سارجنٹ پولیس اسٹیشن مکرجی بھی اس کام میں رؤف کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اور جیسے جیسے اس نامعلوم مقام کی تلاش میں انھیں دیر ہوتی جا رہی تھی، ویسے ویسے اس بات کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا کہ کہیں اصل مجرم خبردار ہو کر راہِ فرار نہ اختیار کر لیں۔ ویسے خلد آباد کے بھوتیا جھیل والے کیس کی تفصیلات اختصار کے ساتھ یہاں کے اخباروں میں بھی شائع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اور اس سے رؤف کا کام اور مشکل ہوا جا رہا تھا۔ پریس پر صرف اخلاقی دباؤ ڈالا جا سکتا تھا، لیکن اخبارات اپنی ضد پر آ جائیں تو وہ حکومت کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

منیجر کے بارے میں ان دو گرفتار شدگان نے صرف یہ بتایا تھا کہ وہ چورنگی کے علاقے میں کہیں رہتا ہے، جس پر آئی جی کی ایماء سے ان میں سے ایک قیدی کو بظاہر آزاد کر

Akram Allahabadi

کے اس کے ساتھ کلکتہ سی آئی ڈی کا ایک افسر لگا دیا گیا تھا تا کہ وہ اسے لے کر چورنگی کے علاقے اور ملحقہ اطراف میں گشت کرے اور اگر مطلوبہ فیجر کہیں نظر پڑ جائے تو فوراً گرفتار کر لے، مگر اس کوشش میں بھی ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہو پائی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا اور رؤف اور ستیش مکرجی اس وقت بھی اسی ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ ان کی توجہ اب صرف ہوٹل کے روزمرہ کے گاہکوں پر مرکوز تھی۔ تقریباً سوا ۴ بجے ایک خشک جسم والا ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے مالک نے رؤف کو اشارہ کیا کہ اس سے بھی پوچھ لیا جائے۔

وہ کھردرے چہرے والا آدمی ایک میز کے نزدیک جا کر بیٹھ گیا۔ وہ صرف ایک گلاس پانی اور ایک چائے کا گاہک تھا، اس لیے بیرے اس پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ رؤف کے اشارے پر ایک ٹیبل والے لڑکے نے آج کا 'امرت بازار پتریکا' اس کی میز پر لے جا کر رکھ دیا۔ وہ شاید اخبار بینی کا بھی شوقین نہ تھا۔ گلاس کا پانی حلق میں انڈیل کر شاید وہ چائے کے اور سرد ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ لباس سے کوئی موٹر میکانک یا مشین مین معلوم ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد رؤف بھی اخبار دیکھنے کے بہانے اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے اسے جلد ہی باتوں میں ملا لیا۔ وہ اوپر سے جتنا خشک قسم کا آدمی نظر آتا تھا، اتنا ہی باتونی نکلا۔ رؤف اسے گھما پھرا کر تذکرہ اسی گاڑی پر لے آیا۔ بحث موٹر گاڑیوں کے ایک اشتہار سے شروع ہو کر گاڑیوں کی قسموں پر آ گئی تھی اور وہ اس وقت حیرت سے چونک پڑا جب اس آدمی نے بتایا کہ اس نے ایک بیڈفورڈ ٹائپ کا ٹرک اکثر اگلی بلڈنگ سے مال لے جاتے دیکھا ہے۔ اس کی باڈی اسٹیل کی اور بند ہے۔

"ارے واہ... اس گاڑی کو تو ہمیں بہت تلاش ہے۔ ہم اس کی باڈی بلڈنگ کا نمونہ دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔" رؤف نے کہا۔

"تو دیکھ لو، یہ کونسی بڑی بات ہے۔"

"اس گاڑی کو ہم بہت تلاش کر چکے ہیں، مل ہی نہیں رہی۔ اب تو اس کمپنی والے کا بھی ٹھکانہ نہیں رہا کہیں۔" رؤف نے بات بنائی۔

"میں نے اس گاڑی کو کبھی کبھی ہری پور کے علاقے میں دیکھا ہے۔ شاید وہ وہیں کے کسی ٹھیکیدار کی ہو۔" اس آدمی نے بتایا۔

"ہری پور؟" رؤف سارجنٹ ستیش کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں، کلکتہ کا مشرقی مضافاتی تعلقہ ہے۔" سارجنت نے کہا۔

"وہاں کس جگہ دیکھا ہے آپ نے؟" رؤف نے پھر سوال کیا۔

"شاید رام سرائے روڈ پر۔ اور مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ میں نے اسے دو تین بار دیکھا ہے۔"

"دیکھنے کا وقت بھی اندازاً یاد ہوگا؟"

"وہی شام کو۔ میں کبھی کبھی وہاں شام کے وقت ہی جاتا ہوں۔"

"خوب... خوب..." رؤف کا چہرہ اس وقت خوشی سے کھل گیا تھا۔

ہوٹل کا بل ادا کر کے اور نئے میکانک دوست کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ دونوں اسی وقت ٹیکسی کے ذریعے ہری پور کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆☆☆☆

لیکن انھیں شاید یہ خبر نہ تھی کہ ان کی گاڑی سے کچھ فاصلے پر ہی ایک مٹیالے رنگ کی پرانی سی کار بھی ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ ہری پور زیادہ سے زیادہ ۲ میل کے فاصلے پر کلکتہ کا مضافاتی علاقہ تھا، جہاں مل مزدوروں اور گوالوں کی آبادی اور پٹ سن کے کارخانوں اور بھینس کے طویلوں کی کثرت تھی۔ جس وقت ان کی کار سرائے ہری پور میں داخل ہوئی، کسٹم چوکی پر ایک سپاہی نے اسے روک لیا۔ یہاں منشیات کی ناجائز نقل وحرکت روکنے کے لیے محکمہ کسٹم کی طرف

Akram Allahabadi

سے ہر گاڑی اور ہر مشتبہ مسافر کی تلاشی لے لی جاتی تھی، مگر سارجنٹ تتیش کو دیکھ کر ڈیوٹی پولیس مین نے انھیں آگے جانے کا اشارہ کر دیا۔ البتہ وہ پیچھے آنے والی گاڑی روک کر اس کی تلاشی لینے لگا۔

"ہمیں جلدی جانا ہے، حوالدار، تمھیں جو دیکھنا ہے، جلدی سے دیکھ لو۔" اس کو کار کے اندر سے ایک نرم و نازک سی آواز سنائی دی۔

ایک خوبصورت سی گوری لڑکی کار میں ایک نوجوان آدمی کے ساتھ بیٹھی تھی جو کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ خوبصورت ہونے کے باوجود لڑکی کی ناک چپٹی اور آنکھیں چھوٹی تھیں۔ وہ ملائی یا چینی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ والا نوجوان آدمی ہندوستانی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔

کانسٹیبل نے گاڑی کو گزرنے کی اجازت دے دی، لیکن اتنی دیر میں رؤف والی ٹکسی کافی دور جا چکی تھی۔ اس نوجوان آدمی نے کار کی رفتار خطرناک حد تک تیز کر دی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔" رؤف نے اچانک اسٹیئرنگ کے پاس لگے ہوئے آئینے میں پیچھے آتی ہوئی کار کا عکس دیکھ کر کہا۔ وہ اس کار کو سرسری نظر سے راستے میں بار بار دیکھ چکا تھا، لیکن اس وقت اس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔

"معاملہ کچھ ایسا ہی دکھائی پڑتا ہے۔" سارجنٹ تتیش نے بھی تائید کی۔

"ایک نئی ترکیب سمجھ میں آتی ہے۔" رؤف کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ جس پر تتیش اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"ہم اس کار کو ڈاج دے کر دیکھیں گے، اگر واقعی یہ ہمارا ہی پیچھا کر رہی تو پھر ہم اسے کسی طرح مغالطہ دے کر خود اسی کا پیچھا کرنے لگیں گے۔" رؤف نے کہا۔

"بات معقول ہے، ایسا ہی کرنا چاہیے۔" سارجنٹ بولا۔

ٹیکسی ڈرائیور ان کی گفتگو سے جان چکا تھا کہ وہ پولیس یا کسی سرکاری محکمے سے تعلق

Akram Allahabadi

رکھتے ہیں، وہ ان کی ہدایت کے مطابق ہی گاڑی چلا رہا تھا۔

"دیکھو، پیچھے ایک کار ہمارا پیچھا کر رہی ہے، اسے ڈاج دینا ہے، سمجھے؟" رؤف نے ڈرائیور سے کہا

"جی ہاں، میں سمجھ گیا۔ آپ دیکھتے جایئے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

آگے ایک چوراہا تھا جس کے نزدیک پہنچتے ہی ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار ایک جھٹکے سے اور بڑھا دی اور ایک دم گاڑی کو ایک دوسری پتلی سڑک پر موڑ دیا۔ پیچھے آنے والی کار جھونک میں آگے نکل گئی۔

"شاباش، اچھا لو، یہ نوٹ سنبھالو۔ ہم اترے جاتے ہیں۔ تم اس طرح گاڑی بھگاتے جانا۔" یہ کہتا ہوا رؤف گاڑی سے کود گیا۔ سارجنٹ بھی اس کے پیچھے گاڑی سے اتر گیا۔ ڈرائیور نے دس کا نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے گاڑی کی رفتار پھر تیز کر دی اور رؤف اور سارجنٹ حتیش فٹ پاتھ عبور کر کے ایک باربر کے سیلون میں گھس گئے۔ اس جگہ شیشے کی کھڑکی سے انھیں سڑک کا منظر صاف نظر آ سکتا تھا۔

"لیکن اگر اس وقت ہمیں فوراً ٹیکسی نہ مل سکی تو؟" رؤف نے اندیشے کا اظہار کیا۔

"ایسا تو نہیں ہے، اس علاقے میں ٹیکسیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ جس قدر ضرورت ہوگی، مل جائیں گی۔" سارجنٹ نے کہا۔

سیلون کا مالک باربر حیرت سے ان دو اجنبیوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا، جن کی اس اچانک آمد کا مقصد اس کی سمجھ میں اب تک نہ آیا تھا۔

"کیا کٹنگ کروائیں گے، صاحب؟" اس نے حتیش سے پوچھا۔

"آں ... ہاں؟ نہیں ... ہم لوگ ایک آدمی کا انتظار کر رہے ہیں، جو یہیں کٹنگ کرانے آنے والا ہے۔" سارجنٹ نے بات بنانی چاہی۔

"تو پھر ادھر آرام سے کرسی پر بیٹھ کر انتظار فرمایئے۔" باربر نے ایک طرف بچھی

ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں نہیں، ہم ٹھیک ہیں ۔آپ کا شکریہ۔" رؤف نے کہا۔"اوہ، شاید وہ کسی اور دکان میں جا رہا ہے۔" باہر دیکھ کر یہ کہتا ہوا رؤف دکان کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا ۔سارجنٹ بھی اس کے پیچھے باہر نکل آیا اور باربر انھیں عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔

وہ کار ابھی ابھی ان کے سامنے سے سڑک پر گزری تھی ۔غالباً وہ ان کی ٹیکسی کو ہی تلاش کر رہی تھی ۔باربر شاپ سے باہر نکلتے ہی اتفاق سے انھیں ایک دوسری گاڑی مل گئی۔اس کا ڈرائیور اگرچہ اس وقت کسی سواری کو لے جانے کے موڈ میں نہ تھا، لیکن دس روپے کے ایک نوٹ نے اس کا موڈ بدل دیا۔

"دیکھو، ابھی آگے جو کار گئی ہے اس کا پیچھا کرنا ہے۔" رؤف نے اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اپن ایسا دھندا نہیں کرتا، صاحب۔" وہ گاڑی کچھ دور لے جا کر کہنے لگا۔

"تمہارے باپ کو بھی کرنا پڑے گا، یہ سرکاری کام ہے۔" سارجنٹ حتیش کو غصہ آ گیا۔

"اپن سرکار کا نوکر نہیں ہے۔" ڈرائیور بھی اکڑ گیا۔

"ارے بھائی، بگڑتا کیوں ہے، لے یہ ایک اور۔" رؤف نے دس کا ایک نوٹ اور تھما دیا اسے۔

"اچھا چلو، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی ڈرائیور سے پالا پڑا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے دوسرا نوٹ بھی جیب میں ڈالتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

"آپ کی مونچھیں پہچان کرا دیں گی آپ کی۔" سارجنٹ نے رؤف کو ٹوکا۔

"میرے پاس داڑھی بھی ہے۔" رؤف نے مسکرا کر کہا اور ساتھ ہی جیب سے اسپرنگ دار نقلی داڑھی نکال کر منہ پر چڑھا لی۔دوسری جیب سے اس نے ایک ٹھنڈی عینک

نکال کر آنکھوں پر لگالی اور اپنی کشتی نما ٹوپی کا جو حلیہ بگاڑا تو وہ حاجیوں جیسی اوندھے کٹورے کی شکل کی ٹوپی بن گئی۔ وہ ایک دم کچھ اور معلوم ہونے لگا۔

"صاحب، آپ کسی سرکس میں کام کرتا ہے کیا؟" ڈرائیور ونڈ اسکرین پر لگے ہوئے آئینے میں رؤف کی بدلی ہوئی شکل دیکھ کر پوچھنے لگا۔ جس پر ستیش نے بگڑنا چاہا، مگر رؤف نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

"نہیں، بھائی۔ میں فلم کمپنی میں کام کرتا ہوں۔" رؤف نے اس جیسا جواب دیا۔

"تو صاحب، آپ ہیروئن کا باپ بنتا ہوگا۔" یہ ڈرائیور کا دوسرا ٹیڑھا سوال تھا۔

"نہیں، صرف ہیرو۔"

"یہ اپنا اپنا کوائی ہے، صاحب۔ ایک زمانہ اپنا بھی تھا۔ وہ کام دکھائے ہیں اسٹیج پر کہ پبلک بوم مارنے لگتا تھا کہ ہم تو ماسٹر منگو ہی منگتا ہے۔" ڈرائیور اپنی شان بگھارنے لگا۔

"تمہارا نام ماسٹر منگو ہے؟"

"ارے واہ، صاحب، واہ۔ سارا کلکتہ اپنے کو جانتا ہے۔ ماسٹر منگو بمبئی والا۔ چھپن چھری کا ہیرو۔" ڈرائیور نے یہ کہتے ہوئے فخریہ سینہ تان لیا۔

"تب تو بڑے کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔" رؤف نے تبصرہ کیا۔

"اپنا بیڈ لک ہے، صاحب، نہیں تو وہ منروا والا سہراب مودی ادھر آیا تھا۔ اپنے کو منگتا تھا فلم مین ہیرو بنانے کو، مگر اپن سوچا کلکتہ کا پانی لگا ہے، تو کلکتہ میں ہی مرے گا۔ سہراب مودی جی ہم کو دس ہجار روپیہ پیش کر رہا تھا، مگر استاد منگو نہیں بولا تو نہیں۔"

"وہ دیکھو وہ گاڑی ہے، استاد۔ بس ہاتھ سے جانے بھی نہ پائے اور اپنے پر اس کو شک بھی نہ ہو۔" رؤف نے دوسری سڑک پر گاڑی کے آنے کے بعد اس کار کو آگے دور جاتے دیکھ کر کہا۔ ستیش اب چپ چاپ بیٹھا ڈرائیور کی باتوں پر مسکرا رہا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹے تک وہ کار اسی علاقے کی مختلف سڑکوں پر بھٹکتی رہی۔ وہ لوگ

Akram Allahabadi

اسی ٹیکسی کو تلاش کر رہے تھے شاید۔ لیکن وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی کافی استاد معلوم ہوتا تھا جو اپنی خالی گاڑی بڑی صفائی سے نکال لے گیا تھا۔

شام ہونے والی تھی جب وہ کار انھیں آگے ایک شاندار انگریزی طرز کے ہوٹل کے سامنے کھڑی نظر آئی۔

"بس، استاد منگو، گاڑی یہیں روک دو اور اگر لمبا دھندا کرنا ہے تو اپنا انتظار کرو۔" رؤف نے گاڑی رکواتے ہوئے کہا۔

"پیسہ لمبا ملینگا تو لمبا دھندا ابھی کرینگا۔" ڈرائیور بولا۔

"تو پھر ادھر ہی ٹھہر کر ہماری واپسی کا انتظار کرو۔" یہ کہہ کر وہ دونوں اس ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

"آپ کو تو وہ پہچان نہ سکیں گے اب، لیکن مجھے دیکھا ہوگا تو وہ فوراً پہچان لیں گے۔" سارجنٹ حتیش نے رؤف سے کہا۔

"آپ یہیں دروازے پر ٹھہر کر انتظار کیجیے، میں اندر دیکھتا ہوں۔" رؤف نے جواب دیا۔

"لیکن یقینی طور پر بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لوگ واقعی ہمارے سلسلے کی مشکوک شخصیتیں ہیں، ممکن ہے وہ کوئی اور ہوں۔" حتیش نے اظہارِ خیال کیا۔

"سراغ رسانی امکانی حالات پر ہی کی جاتی ہے اور اگر یہ واقعی مشتبہ لوگ ہوئے تو ان کا پیچھا چھوڑ دینا کسی صورت عقلمندی نہیں۔ انھیں ہماری تلاش کا مقصد ختم کرنے کا کافی موقع مل جائے گا۔" رؤف نے اسے سمجھایا۔

"اچھا ہے۔ آپ جایے، میں یہاں انتظار کرتا ہوں۔ مدد کی ضرورت ہو تو وسل دے دیجیے گا۔" سارجنٹ یہ کہہ کر دروازے پر رک گیا اور رؤف دونوں طرف محتاط نظریں ڈالتا ہوا اندر چلا گیا۔

Akram Allahabadi

ہوٹل اندر سے بلند چھت والا ایک شاندار ہال رکھتا تھا، جس کی دیواروں پر بنگالی فنکاروں نے کلاسیکل آرٹ کے بہترین نمونے پینٹ کیے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں زیادہ تر کلکتہ کے مضافات میں تفریح کے لیے آنے والے سیاح، یا کلکتہ میں لنگر انداز ہونے والے ملکی جہازوں کے عملے کے لوگ، جو دن دو دن کے لیے کلکتہ کو تفریح کے لیے نکل پڑتے ہیں، آتے ہوں۔ میزوں کے گرد کرسیاں ڈالے اس وقت جو لوگ بیٹھے تھے، ان میں زیادہ تر ملاحوں جیسے لباس والے لوگ نظر آتے تھے۔ اسی ہال کے دوسرے سرے پر پرائیوٹ کمروں کی پوری لمبی قطار تھی، جسے پلائی ووڈ کے پارٹیشن کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ ان کی پرائیوٹ روم اور فیملی روم کی چھوٹی چھوٹی تختیاں لٹکی ہوئی تھیں۔

باہر بیٹھے ہوئے آدمیوں میں اسے وہ دونوں شکلیں نظر نہ آئیں جو باربر کی دکان کے سامنے سے اس کار کے گزرتے وقت انھوں نے کار میں بیٹھے دیکھی تھیں۔ کم از کم اس لڑکی کی جھلک رؤف کو اچھی طرح یاد تھی۔ اور یہاں وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

رؤف نے اشارے سے ایک بیرے کو پاس بلایا اور اس کے ہاتھ پر پانچ روپے کا ایک نوٹ رکھ دیا۔

''یہاں ابھی ابھی ایک مرد اور ایک چپٹی سی شکل کی گوری عورت آئے ہیں؟'' رؤف نے پوچھا۔

''مس جاپان؟'' بیرا مسکرا کر بولا۔ ''وہ اس روم میں ہیں۔'' اس نے مسکرا کر بتایا۔

''کیا تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟'' رؤف نے سوال کیا۔

''اس کا یہ نام ہم لوگوں نے اس کی شکل کی وجہ سے ہی رکھا ہے۔'' بیرے نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''وہ ایک آدمی کے ساتھ اکثر یہاں آیا کرتی ہے۔'' وہ بولا۔

''وہی سانولا سا جون سا؟'' رؤف نے پھر پوچھا۔

''ہاں ہاں، وہی۔ شاید تگڑا سا مرغا پھانس رکھا ہے سالی نے۔'' بیرا جو کافی زندہ دل

بھی معلوم ہوتا تھا، اپنے انداز میں بے تکلفانہ بولا۔

تو کیا وہ اچھی عورت نہیں؟''

''یہ اچھی بری پسند کرنے والے جانیں۔'' بیرا معنی خیز لہجے میں بولا۔

''یہاں کیا وہ دوسرے مردوں کے ساتھ بھی آتی ہے؟'' رؤف نے سوال کیا۔

''ایسا تو نہیں دیکھا، مگر ہے بہت ایڈوانس۔ شرم تو ذرا آنکھوں میں نہیں معلوم ہوتی۔''

''اس کے بارے میں اور کچھ جانتے ہو کیا؟''

''خدا بچائے ایسوں سے، صاحب۔ اپنے کو ہوٹل میں نوکری کرنی ہے۔ کون آتا ہے، کون جاتا ہے، یہ جاننے بیٹھیں تو کام کیسے کریں۔'' بیرے نے پھر صاف گوئی اختیار کی۔

''خیر، اتنا کافی ہے، تمہارا شکریہ۔'' وہ یہ کہہ کر ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔

''صرف چائے اور پیسٹری لے آؤ۔'' اس نے بیرے کو آرڈر بھی دے دیا اور پھر اس کے جانے کے بعد اس نے اپنی دزدیدہ نظریں اسی روم پر لگا دیں، جس کی طرف بیرے نے اشارہ کیا تھا۔

رات ہو چلی تھی اور اسی کے ساتھ اس ہوٹل کی رونق بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ رؤف کو یہاں کافی دیر بیٹھنا پڑا، لیکن اس کمرے سے کوئی باہر نہ نکلا۔ اسے شبہ ہو رہا تھا کہ کہیں بیرے نے اسے غلط تو نہیں بتایا، یا وہ غلط لوگوں پر تو وقت ضائع نہیں کر رہا؟

تقریباً رات کو ۸ بجے وہ اس کمرے کی طرف ایک تیسرے آدمی کو جاتے دیکھ کر چونک پڑا۔ آنے وال اکسی قدر کریہہ المنظر قد آور آدمی تھا، جس نے بدن پر قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا، لیکن اپنے انداز رفتار سے اور بار بار پلٹ پلٹ کر ادھر ادھر دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یا تو کافی محتاط آدمی ہے، یا اس وقت گھبرایا ہوا ہے۔ وہ اس روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

یہ دیکھ کر رؤف اٹھ کھڑا ہوا۔ بیرے کو وہ بل پلیٹ میں ہی ادا کر چکا تھا۔ وہ سیدھا باہر نکل آیا۔

Akram Allahabadi

یہاں ستیش اب تک کھڑا تھا۔

"جلدی سے میرے پیچھے آیے۔" یہ کہہ کر وہ پھر اندر لوٹ آیا۔ ستیش بھی اس کے پیچھے اندر آ گیا۔ وہ روم ابھی ابھی خالی ہوا تھا، جو اس مشتبہ شخصیتوں والے روم سے ملحق تھا۔ اسے ان لوگوں نے کافی اور بٹر کیک کا آرڈر دے دیا۔

رؤف کے اندازے کے مطابق وہ مرد اور وہ چپٹی گوری عورت جن کا ساتھی اب نو دو گیارہ بھی بن چکا تھا، اسی پاس والے کمرے میں موجود تھے اور وہ کسی بھی ممکن طریقے سے ان کی گفتگو سننا چاہتا تھا۔

"میرے پاس سگریٹ پائپ ہے، شاید وہ کام آ جائے۔" یہ کہہ کر ستیش نے جیب سے سگریٹ پائپ نکالا اور اس کا باریک سرا درمیانی پارٹیشن کے ایک کونے میں پڑی ہوئی باریک سی دراڑ میں رکھ دیا۔ پھر موٹے سرے سے وہ کان لگا کر اس کمرے کی آوازیں سننے لگا۔ وہاں گفتگو بہت دھیمی، بلکہ سرگوشی کے لہجے میں ہو رہی تھی۔ پھر بھی چند جملے اس کے پلے پڑ گئے۔ ان میں سے کوئی کہہ رہا تھا۔

"خدا جانے وہ کمبخت کہاں غائب ہو گئے، ہم نے تو کافی محنت کی تھی ان کے تعاقب میں۔"

"آہستہ بولو۔" ایک باریک سی آواز نے انھیں ڈانٹا اور پھر کھسر پھسر ہونے لگی۔

"وہ سب گرفتار ہو چکے ہیں۔" پھر کسی کا یہ جملہ ستیش کو سنائی دیا۔

"ہمیں کسی قسم کا ثبوت پہنچانے والی ہر چیز تباہ کر دینی چاہیے۔" شاید دوسرے نے کہا۔

"خدا کے لیے، آہستہ بولو، ڈاکٹر۔" کسی نسوانی آواز نے پھر اسے انگریزی میں ڈانٹا۔

"اب کیا آہستہ بولوں، بے احتیاطیوں نے تو پہلے ہی پھانسی کے پھندے سے

قریب کردیا ہے۔" شاید یہ ڈاکٹر کا جھنجلایا ہوا جواب تھا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ پھر چند منٹ کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے وہ لوگ اٹھ رہے ہوں۔ کرسیاں کھسکنے کی آواز نے رؤف اور ستیش کو چونکا دیا۔ رؤف اس کمرے کے دروازے کو ذرا سا کھول کر اس کے دراز سے باہر جھانکنے لگا۔ واقعی وہ تینوں اپنی گفتگو ختم کرکے اس کمرے سے باہر جارہے تھے۔

"آپ بل چکا کر پیچھے آیے، میں ان کے پیچھے چلتا ہوں۔" رؤف نے کہا۔ اور ستیش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جس وقت وہ تینوں ہال کو عبور کرکے ہوٹل کے دروازے تک پہنچ گئے، اس وقت وہ تیزی سے کمرے سے نکلا اور ہال کو عبور کرتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔

باہر وہ تینوں ایک جگہ کھڑے ہو کر کچھ گفتگو کرنے لگے۔ پھر ان میں سے وہ نوجوان آدمی اور چپٹی عورت تو اسی چھوٹی کار میں بیٹھ گئے اور وہ تیسرا آدمی ایک لینڈ وباڈی سیاہ رنگ کی کار میں بیٹھ گیا، جسے وہ خود ڈرائیو کررہا تھا۔ وہ دو مختلف سمتوں کو روانہ ہوگئے۔

رؤف اس وقت عجیب مخمصے میں الجھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دونوں میں سے کس کے تعاقب میں جائے۔ اتنے میں سارجنٹ ستیش بھی آپہنچا۔

"ستیش صاحب، آپ اس جوڑے کا تعاقب کیجیے، میں اس نئے آدمی کے پیچھے جاتا ہوں۔" رؤف نے اس سے کہا۔

"وہ ٹیکسی اب تک اسی جگہ کھڑی ہے، آپ اسے لے لیجیے، میں دوسری کیے لیتا ہوں۔" ستیش نے کہا۔

چنانچہ رؤف دیوار کے کنارے کنارے اندھیرے میں چلتا ہوا اس ٹیکسی تک پہنچ گیا اور اس میں بیٹھتے ہی اس نے اسے اس سیاہ رنگ کی کار کے پیچھے دوڑا دیا۔ ستیش کو وہیں کھڑی ہوئی ایک دوسری ٹیکسی مل گئی۔ اور وہ اس میں چل پڑا۔

وہ پراسرار ڈاکٹر شاید اس خیال سے شاید پہلے ہی چونکا ہوا سا تھا کہ کوئی اس کا

Akram Allahabadi

تعاقب نہ کر رہا ہو، وہ گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے بار بار دائیں بائیں دیکھتا جاتا۔ اس کی گاڑی مین اسٹریٹ کو چھوڑ کر اب تنگ و تاریک گلیوں میں دوڑنے لگی۔ رؤف کی ٹیکسی اب بھی اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ کار ایک ایسی گندی سی آبادی میں داخل ہوگئی، جہاں شاید کسی کارپوریشن کے محکمہ صحت و صفائی کے آرام پسند افسروں کا گزر نہ ہوا ہوگا۔ جس گلی میں وہ سیاہ رنگ کی کار داخل ہوئی تھی، اس میں کافی تعفن پھیلا ہوا تھا، جیسے اس کے کناروں کی آبادی کے تساہل پسند لوگ، یا ان کے بچے رفع حاجت کے لیے بھی استعمال کرتے ہوں۔ رؤف نے رومال جیب سے نکال کر منہ پر رکھ لیا۔

''سور، سڑک کو بھی سنڈاس بنا لیتے ہیں۔'' ڈرائیور نے ایک موٹی سی گالی کے بعد اس مقام کے باشندوں کی تعریف کی۔

لیکن جیسے ہی ان کی گاڑی اس گلی کے موڑ پر پہنچی، ڈرائیور نے بریک ماردیا۔ وہ کار ایک سو قدم آگے رک کر پھر اسٹارٹ ہو رہی تھی۔ رؤف نے اس کا نمبر تو نوٹ کر ہی لیا تھا۔ کار سے اسی ڈاکٹر کو اتر کر ایک معمولی قسم کے دو منزلہ مکان کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر وہ وہیں ٹیکسی سے اتر گیا۔

''یہ لو دس روپے اور میرا انتظار ایک گھنٹے تک کرنا، اگر میں نہ آیا تو تم جا سکتے ہو۔''

''اگر آپ نہ لوٹیں تو تو کیا میں پولیس میں خبر کر دوں؟'' ڈرائیور کے اس سوال پر رؤف چونک پڑا۔

''یہ کیسے سمجھا تم نے؟'' رؤف نے اس سے عجیب لہجے میں پوچھا۔

''پولیس والے ہی اتنے کھلے بندوں کسی کا پیچھا کر سکتے ہیں۔'' ڈرائیور نے کہا۔

''آدمی عقلمند معلوم ہوتے ہو۔ خیر، میرا انتظار کرو۔'' یہ کہہ کر وہ اس مکان کی طرف چل دیا، جس میں وہ پراسرار ڈاکٹر داخل ہوا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اسے اس مکان کا زینہ چڑھتے دیکھ لیا تھا۔

Akram Allahabadi

اس وقت اس مکان سے کچھ فاصلے پر بھی کوئی اسی مقام کا آدمی ایک سفید دھوتی باندھے کھڑا تھا۔

"کیوں، بھائی، یہاں کوئی ڈاکٹر رہتا ہے؟" رؤف نے پوچھا۔

"ڈاکٹر...؟ یہاں ...؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔ "مسٹر، نئے نئے آئے ہو شاید۔" وہ رؤف کو سر سے پیر تک دیکھ کر تبصرہ کرنے لگا۔

"تو پھر یہ ابھی ابھی ایک سوٹ بوٹ والا اوپر گیا ہے، یہ کون تھا؟"

"ہوگا کوئی، بیسیوں آتے جاتے رہتے ہیں مشتری کے پاس۔" وہ لاپرواہی سے بولا۔

"اوہ، تو یہ مشتری کا کوٹھا ہے۔" رؤف نے اس طرح کہا جیسے وہ اسے جانتا ہو۔

"ہاں، کیوں...؟ پھنسا ہے اس کے جال میں؟ ارے دوست، کہو تو اس سے ہزار درجہ بہتر درجہ بہتر بڑھیا مال بتاؤں۔" وہ آدمی ڈھٹائی سے بولا۔

"نہیں بھائی، بس مشتری ہی کافی ہے۔ سنا ہے گاتی بھی بہت عمدہ ہے۔"

"گاتی عمدہ ہے، مگر نخرے بہت ہیں حرامزادی کے۔ کسی ڈانسنگ اسکول میں ناچ بھی سکھاتی ہے اور اپنے کو بڑی اونچی شے سمجھتی ہے۔" جلے ہوئے انداز میں یہ کہہ کر اس آدمی نے زمین پر تھوک دیا۔

"کم از کم دیکھا تو جائے۔"

"تو جاؤ، روکا کس نے ہے۔ عقل بتاؤ تو الٹے بھاگے۔" یہ کہہ کر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا وہاں سے کھسک گیا۔

رؤف نے جیب سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ سلگائی اور پھر اپنی داہنی مونچھ پر تاؤ دیتا ہوا اس مکان کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اندر سے عمارت کی حالت اچھی تھی۔ اوپری منزل پر پہنچتے ہی اسے طبلہ ٹھنکنے کی آواز سنائی دی۔

زینہ چھوڑ کر جیسے ہی وہ گیلری میں گھوما، سامنے اسے کمرے کا دروازہ کھلا نظر آیا، جس میں اندر سے فلوریسینٹ ٹیوب کی اجلی روشنی آرہی تھی اور دروازے میں ہی دہلیز پر بہت سے جوتے رکھے تھے۔ اندر کوئی باریک سریلی نسوانی آواز نغمہ سرائی کر رہی تھی اور سارنگی ہارمونیم اور طبلوں کی ملی جلی آوازیں سر ملاتی سنائی دے رہی تھیں۔

"تشریف لایئے۔" رؤف کو اندر جھانکتے دیکھ کر ایک بوڑھی سی ٹیڑھی آنکھوں والی عورت نے کہا۔

"جی شکریہ۔ میں اپنے ایک دوست کو دیکھ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر رؤف نے اندر موجود آدمیوں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے سر پھر باہر نکال لیا۔

یہ عجیب سا موقع تھا۔ باقی کمرے دیکھ ڈالنے پر بی اے وہ ڈاکٹر کہیں نظر نہیں آیا۔

"اے بھائی۔" رؤف نے گیلری سے گزرتے ہوئے ایک آدمی کو ٹوک دیا۔ وہ ٹھہر کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"کیا اس بلڈنگ کا کوئی اور راستہ بھی ہے باہر جانے کا؟"

"نئے نئے آئے ہو کیا؟ وہ سنڈاس کے پیچھے سے دوسری طرف اترنے کا زینہ ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ رؤف تیزی سے سنڈاس کی طرف دوڑا۔ واقعی اس کے پیچھے سے نیچے کی طرف جاتا ہوا لکڑی کا زینہ تھا۔ وہ بہت پھرتی سے زینے سے اترتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ یہ دروازہ ایک دوسری گلی میں تھا اور گلی اس وقت صاف پڑی تھی، صرف ایک رکشا والا پان والے کی دکان کے سامنے کھڑا اونگھ رہا تھا۔

"اے، ابھی ادھر سے کوئی کار گئی ہے کیا؟"

"کار...؟" رکشا والا جیسے اس کا مطلب سمجھ نہ سکا۔

"کوئی موٹر؟"

"ہاں، موٹر۔ ایک موٹر ادھر کھڑی تو تھی ابھی، مگر کہاں گئی؟ کون جانے؟"

Akram Allahabadi

"اس مکان سے کوئی اتر کر کوئی بیٹھا تھا اس پر؟" رؤف نے پوچھا۔

"اس مکان سے تو سینکڑوں اترتے چڑھتے رہتے ہیں، بابو جی۔" رکشا والے نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

"میں ابھی کی بات پوچھ رہا ہوں؟"

"ابھی تو آپ ہی اترے ہیں۔" وہ بولا۔ اس پر پان کی دکان والا قہقہہ مار کر ہنس پڑا، مگر جب رؤف نے اس کی طرف گھور کر دیکھا تو شاید وہ اس کی بڑی بڑی مونچھوں سے مرعوب ہو کر چپ ہو گیا۔

"سالے، چالان کروں گا تو بھیجا ٹھکانے آ جائے گا ابھی۔" رؤف نے رکشا والے کو دھمکی دی اور یہ دھمکی کارگر بھی ہو گئی۔

"صاحب، میں تو سچی بات کہہ رہا تھا۔" وہ سہم کر بولا۔

"مجھ سے پہلے یہیں سے کوئی اتر کر اس کار میں گیا ہے؟"

"ہاں صاحب۔ ایک سوٹ بوٹ والا کالا سا صاحب تھا۔" رکشا والا راہِ راست پر آ گیا۔

"کدھر گئی ہے وہ کار؟" رؤف نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"ادھر، سامنے۔" اس نے مغرب کی طرف اشارہ کیا۔

"کتنی دیر ہوئی؟"

"بس پانچ منٹ ہوئے ہوں گے۔" پان والے نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

"اوہ، نکل گیا کمبخت۔" رؤف یہ دیکھ کر کہ گلی میں ایک بھی ٹیکسی نہ تھی، ہاتھ ملنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

درندہ صفت ڈاکٹر

ایک گھنٹے بعد وہ چورنگی کے پولیس اسٹیشن پر حسبِ اقرار سارجنٹ عتیش کا انتظار کر رہا تھا۔ سارجنٹ رات کے ۱۱ بجے کے بعد لوٹا ۔ رؤف کو دیکھتے ہی اس نے مسّرت کا نعرہ مارا۔

"کیا ہوا؟" رؤف نے پوچھا۔

"وہ دونوں چورنگی کی ایک بدنام گلی میں رہتے ہیں۔ شاید اس طرح ان کی شخصیت پر کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا۔"

"ان کی مشکوک شخصیت کے بارے میں کوئی ثبوت فراہم کر سکے کیا؟" رؤف نے پوچھا۔

"ہاں۔ ان کی گاڑی کے رکتے وقت اپنی ٹیکسی سے اسے اوورٹیک کرتے ہوئے لڑکی کا صرف ایک جملہ سن سکا تھا۔"

"کیا؟"

"ڈاکٹر ہمیں رام سرائے پر مل جائے گا۔"

"تو اس کا مطلب یہ کہ وہ لوگ آج ہی رام سرائے پہنچیں گے۔" رؤف بڑبڑایا۔

"آج جانا ہوتا تو وہ اپنی قیام گاہ پر کیوں جاتے۔" سارجنٹ بولا۔

"یا تو ڈاج دینے یا پھر انھیں وہاں سے کوئی سامان لینا ہوگا۔ ممکن ہے وہ لوگ آج ہی رات کو فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہوں۔" رؤف نے سارجنٹ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو ہمیں رام سرائے کا محاصرہ فوراً کر لینا چاہیے۔" عتیش یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

Akram Allahabadi

"پولیس فورس تو ہمیں سنٹرل اسٹیشن سے ہی بلانی پڑے گی؟" رؤف نے پوچھا۔

"ہاں۔ ممکن ہے یہاں ہمیں فوری طور پر کافی آدمی نہ مل سکیں۔" سارجنٹ نے کہا۔

"چنانچہ رؤف نے اسی اسٹیشن سے سنٹرل پولیس اسٹیشن پر ایس پی مہندر کو فون پر تمام حالات سے مطلع کر دیا۔

"آپ لوگ اسی جگہ ٹھہریے، میں خود بھی مسلح سپاہی لے کر پہنچتا ہوں۔" ایس پی نے ہدایت کی۔

اور کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے وہ دونوں پولیس اسٹیشن کے سامنے والے ایک گجراتی ہوٹل میں رات کا کھانا کھانے چلے گئے۔

اندازے کے مطابق نصف گھنٹے بعد ہی ایس پی مہندر آ پہنچے۔ ان کے ساتھ دو سب انسپکٹر، دو حوالدار اور بیس سپاہی تھے، جو پیچھے پولیس ٹرک میں تھے۔ چورنگی پولیس اسٹیشن پر ایس پی کے آتے ہی کھلبلی سی مچ گئی۔ ادھر ادھر وقت گزاری کے لیے بکھرے ہوئے کام چور کانسٹیبل بھی چوری چھپے پولیس اسٹیشن میں پہنچ کر اٹینشن ہو گئے، مگر ایس پی کو ان کی حاضری سے تعلق نہ تھا۔ وہ اس وقت رؤف اور سارجنٹ حتیش کو اپنی کار میں بٹھا کر رام سرائے کی طرف روانہ ہو گئے۔ پولیس کا ٹرک پیچھے آ رہا تھا۔ چورنگی پولیس اسٹیشن کے اسٹاف کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ پولیس اتنی تعداد میں کہاں اور کیوں جا رہی ہے، لیکن معاملہ ضرور اہم تھا۔ اس پر سب آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ایس پی مہندر کی غیر متوقع آمد خود اس اہمیت کا ثبوت تھی۔

☆☆☆☆☆☆

رام سرائے ایک پرانی تاریخی عمارت تھی، جسے بنگال کے مغلیہ صوبیدار نے کسی زمانے میں ہگلی میں اشنان کرنے والے یاتریوں کی سہولت کے لیے اپنی طرف سے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے چار چھوٹے چھوٹے برج تھے اور باہر چہار دیواری کھنچی ہوئی تھی، جو جگہ جگہ سے

اب ٹوٹ چکی تھی۔

یہ پرانی سرائے انقلاب زمانہ کے ہاتھوں اب کھنڈر بن چکی تھی، لیکن اس کا بیچ کا حصہ آج بھی مکمل تھا۔

ایک شب گشت تانگے والے سے انھیں صرف اس قدر معلوم ہوسکا کہ کلکتہ کی کی کمپنی نے اس کی کھدائی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور اسی کمپنی کے کچھ آدمی اس میں رہتے ہیں۔

یہ سرائے آبادی سے علاحدہ ایک ناہموار خطۂ زمین پر واقع تھی۔ پولیس نے بڑی خاموشی سے اس کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت ایک بجنے میں چند منٹ باقی تھے، لیکن ایس پی مہندر نے رؤف اور سارجنٹ حمیش کی معیت میں جیسے ہی اس کی چاردیواری میں قدم رکھا، وہ یہ دیکھ کر چونک پڑے کہ سرائے کے وسطی حصے میں کچھ روشنی ہورہی تھی اور آم کے گھنے درخت کے سائے میں اس وقت دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔

"بہت آہستگی سے آگے بڑھو۔ وہ لوگ شاید جاگ رہے ہیں۔" ایس پی مہندر نے کہا۔

"میرے خیال میں تو فرار کی تیاری ہے۔" رؤف نے کہا۔

لیکن ابھی وہ بمشکل چند قدم ہی چل پائے تھے کہ اچانک ایک فائر ہوا اور گولی سنسناتی ہوئی ایس پی مہندر کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

"لیٹ جاؤ، زمین پر۔" ایس پی یہ کہہ کر زمین پر اوندھے گر پڑے۔ ساتھ ہی پیچھے آنے والے بھی۔

حمیش نے جوابی فائر کرنا چاہا، تو ایس پی نے ہاتھ تھام لیا۔ وہ زمین پر گر کر ایک شکستہ کوٹھڑی کی طرف لڑھکنے لگے، لیکن اس انجانی سمت سے مسلسل فائرنگ شروع ہوگئی۔

"اوہ، شاید گولیاں اس درخت سے چل رہی ہیں۔" یہ کہہ کر رؤف نے ٹارچ کی روشنی اسی آم کے درخت پر ڈالی۔

Akram Allahabadi

"ستیش، تم ان موٹروں کے ٹائروں کو بے کار کر دو گولی مار کر۔" یہ کہتے ہوئے ایس پی نے اس درخت پر نظر آنے والی ایک سفید سی چیز کو نشانے میں لے کر فائر کر دیا۔ رؤف کی ٹارچ کی روشنی اب تک وہیں جمی ہوئی تھی۔ پیچھے آنے والے سب انسپکٹر نے بھی ایس پی کی تقلید کرتے ہوئے اسی نشانے پر فائرنگ شروع کر دی۔

اچانک ایک چیخ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی اس درخت سے دو آدمی لڑھک کر نیچے گرے۔ ایک تو گرتے ہی اٹھ کر عمارت کے اس روشن حصے کی طرف بھاگا اور دوسرا وہیں پڑا رہ گیا۔

اس کے بعد پولیس کے آگے بڑھتے ہی اس عمارت کی کھڑکیوں سے لگاتار فائرنگ شروع ہو گئی۔

آدھی رات کو سارا علاقہ بندوقیں چلنے کی آوازیں سن کر چونک کر جاگ اٹھا اور آبادی کی طرف سے لوگ اس طرف دریافت حال کے لیے دوڑ کر آنے لگے۔

وہ لوگ جم کر مقابلہ کر رہے تھے۔ چنانچہ پلان کے مطابق ایس پی مہندر اپنے چند آدمیوں کے ساتھ محاذ سنبھالے رہے اور رؤف اور ستیش نے پانچ پانچ آدمی ساتھ لے کر دونوں سمتوں سے کھسکتے ہوئے عمارت کے دائیں بائیں حصے پر حملہ کر دیا۔

اب مقابلہ لاحاصل تھا۔ فائرنگ بند ہو گئی۔ یا تو انھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے یا رؤف اور ستیش میں سے کوئی ان کے سر پر پہنچ گیا تھا۔

چنانچہ جس وقت ایس پی مہندر اس شکستہ برآمدے میں داخل ہوئے، جس کے دو کمروں کے اندر سے روشنی ہو رہی تھی تو وہ یہ دیکھ کر مسکرا دیے کہ رؤف اور اس کے آدمیوں نے اس کمرے میں موجود چار آدمیوں کو اپنی بندوقوں اور پستول کی زد میں لے رکھا ہے۔

ان چار آدمیوں میں ایک عورت تھی۔ وہی چپٹی سی، مگر خوبصورت مس جاپان۔ اس کے علاوہ باقی تین میں ایک وہی ڈاکٹر، دوسرا وہی نوجوان آدمی اور تیسرا ایک اجنبی شخص تھا۔

ان کی گرفتاری کے ساتھ ہی رام سرائے کے چپے چپے کی تلاش شروع ہو گئی۔ چند کمرے جو اندر سے کافی آراستہ اور زیرِ استعمال نکلے، شاید ان بدمعاشوں کی خفیہ رہائش گاہ تھے۔ باقی ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہی وہ حیرت سے چونک پڑے۔ یہاں لمبی لمبی آپریشن ٹیبلیں بچھی تھیں اور ایک الماری میں سرجری کا بہت سا سامان بھرا تھا۔ چھت میں بڑی اسپاٹ لائٹ لگی ہوئی تھی اور کھڑکیوں اور دروازوں پر سیاہ پردے لٹک رہے تھے۔ یہ پورا آپریشن روم معلوم ہوتا تھا۔

وہ ابھی اس کمرے کا معائنہ ہی کر رہے تھے کہ اچانک ایک فائر کی آواز بلند ہوئی اور اے سی پی مہندر نے پلٹ کر دیکھا تو ڈاکٹر نے خودکشی کر لی تھی۔ اس نے اسی پستول کی لبلبی دبا دی تھی جو ایک سب انسپکٹر نے اسے خوف زدہ کر کے قابو میں رکھنے کے لیے اس کی کنپٹی سے لگائے ہوئے تھا۔

دو آدمی اسے سنبھالنے لگے اور ایس پی اس کا بیان لینے کے خیال سے اس پر جھک گیا۔ ادھر ستیش اور ایک سب انسپکٹر نے عمارت کی تلاشی جاری رکھی۔

اپنے آخری وقت کے بیان میں یہ کریہہ المنظر ڈاکٹر نے قبول کر لیا کہ اس کا نام مارگوا فرنانڈس ہے۔ ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد اپنی پریکٹس میں ناکام رہ کر اس نے اس انسانیت سوز شعار کو اپنا لیا تھا۔ وہ ایک بدنام ڈاکٹر تھا، جس پر ایک عرصے سے دو بنگالی خوبرو لڑکیوں کے اغوا کے الزامات بھی تھے، جن کی وجہ سے وہ روپوش ہو کر اس غیر آباد جگہ پر 'شوکارڈ' کے لیے زندہ انسانوں کے جسموں سے بے رحمی کے ساتھ مطلوبہ اعضا علاحدہ کرنے کا کام کر رہا تھا۔ دوسرا سانولا آدمی شوکارڈ کا درندہ صفت منیجر تھا، جس کی رہنمائی میں یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ اور وہ چپٹی سی جوان، مگر بے رحم عورت، اس کام میں دوطرفہ ایجنٹ کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ تصدیق کے ساتھ ان اعضاء کو جاپانی پرائیوٹ سرجیکل اسپتال کے لیے روانہ کرتی تھی۔

اس انکشاف کے ساتھ ساتھ پولیس نے اس عمارت کے اندر ایک زمین دوز

Akram Allahabadi

کمرے سے کئی مردہ انسانی ڈھانچے بھی برآمد کیے، جن میں بعض کی بعض حصوں کی ہڈیاں بھی کم تھیں۔

☆☆☆☆☆☆

پولیس کے آدمی ان درندوں کی اس حیثیت سے واقف ہو کر ان پر اس طرح دانت پیسنے لگے کہ بس چلے تو ان کی ابھی بوٹیاں بوٹیاں اڑا ڈالیں، لیکن قانون کے ہاتھ نے انھیں روک لیا۔

تمام قیدی مع برآمد شدہ سامان اور ہڈیوں کے انسانی ڈھانچوں کے کلکتہ پولیس ہیڈ کوارٹرز لائے گئے۔

☆☆☆☆☆☆

رؤف نے صبح ہوتے ہی سب سے پہلے ٹرنک کال پر سپرنٹنڈنٹ خان کو تمام حالات اور گرفتاریوں سے آگاہ کر دیا اور خلد آباد میں بھی ان گرفتاریوں کی اطلاع کے ساتھ مسرت وسکون کی لہر دوڑ گئی۔

خان نے رؤف کو ٹرنک کال پر ہی ہدایت کر دی کہ اب وہ باقی معاملات کلکتہ پولیس کے حوالے کر کے بمبئی واپس آ جائے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

واپسی

اسی شام کو خلد آباد میں ڈی آئی جی کے یہاں خان اوراس کے ساتھیوں کی چائے کی دعوت تھی، جس میں شرکت کا وعدہ خان پہلے ہی کر چکا تھا۔ اس دعوت میں پہلی بار وہ کھل کر تمام دوسرے مقامی پولیس افسروں کے سامنے آیا اور وہ اس سے مل کر عجیب سی شرمندگی محسوس کرتے رہے۔ کیونکہ ان کے ہوتے ہوئے بمبئی کے اس سراغ رساں نے ایک اتنی خطرناک اور ہلاکت خیز گروہ گروہ کا سراغ لگا کر اس کی دھجیاں بکھیر دی تھیں، جس کے بارے میں وہ شبہ تک نہ کر سکے تھے۔

سب سے زیادہ چھاتی نواب مقدر کی پھولی ہوئی تھی۔ وہ اس فخر سے اکڑے اکڑے نظر آرہے تھے کہ ان کے منہ بولے بھتیجے نے سب کے ناک کان کاٹ دیے تھے اور بالے نہ جانے کس مصلحت کے پیش نظر ان پر اور زیادہ پولس پھیرتا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس دعوت سے یہ لوگ اپنی کار میں واپس لوٹنے لگے تو اسرار اور ابراہیم تو خان صاحب کی تعریف فرمارہے تھے، لیکن بالے ان سے دو قدم اور آگے بڑھ گیا۔

"بھئی، سچ پوچھیے تو اس فتح کا سہرا قبلہ نواب صاحب کے سر ہے۔ یہ ہمیں یہاں رخصت گزارنے بلواتے اور نہ سب کچھ ہوتا۔" یہ کہہ کر وہ نواب صاحب کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

نواب صاحب اور زیادہ پھول گئے تھے۔ خان مسکرا دیا۔

"دال پھر بھی نہ گلے گی، بیٹے۔" خان نے دبے لہجے میں کہا۔

"تو میں نمک ڈال لوں گا۔" بالے نے ایک سیکنڈ کے لیے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

خان مسکرا کر خاموش ہوگیا اور نواب مقدر جنگ کا سینہ فخر سے اور زیادہ تن گیا۔ موٹر

Akram Allahabadi

کا یہ سفر ان ہی دلچسپیوں میں گزرا اور پیلی کوٹھی پہنچنے سے پہلے یہ طے پا گیا کہ سونے سے پہلے ابھی خان صاحب اس حادثے کے مختلف پہلوؤں پر اور روشنی ڈالیں گے۔ خان نے منظور کرلیا۔ وہ دراصل خود بھی یہی چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے ابھی تک اسرار، ابراہیم اور بالے وغیرہ سے ان حالات و واقعات کا ذکر نہیں کیا تھا، جو صرف اسے معلوم تھے۔ کوٹھی پہنچ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سگریٹ سلگائے۔

''آج سے تقریباً پانچ سال پہلے اس جھیل میں آٹھ افراد کے ڈوب جانے کا ایک حادثہ ہوا تھا۔ آپ کو یاد ہے، چچا جان؟'' خان نے نواب صاحب سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

نواب صاحب اپنے حافظے پر زور ڈالنے لگے اور پھر چونکے۔

''جی ہاں، جی ہاں، مجھے یاد آیا۔ میاں، تمہیں وہ واقعہ کس طرح معلوم ہوا؟'' نواب صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ میرا کام ہی ہے، قبلہ۔''

''بالے، ابراہیم، اسرار وغیرہ ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔

''مداری...'' بالے نے کچھ کہنا شروع کیا تھا، لیکن خان کی گھورتی ہوئی نظریں اس پر پڑ گئیں تو وہ چپ ہو گیا۔

''کیا کہہ رہے تھے؟'' خان نے تیز ہو کر پوچھا۔

''بچوں کی باتوں میں بزرگوں کو دخل نہ دینا چاہیے۔'' بالے نے پالسن پھیرا۔

''بچوں کی بدتمیزیوں پر بزرگوں کو جوتا کاری کرنا چاہیے۔ سیدھی طرح بولو، کیا کہہ رہے تھے؟'' خان نے ڈانٹا۔

''میں کہہ رہا تھا کہ مداری لوگ بڑے چار سو بیس ہوتے ہیں۔''

''جھوٹ، سچ سچ بتاؤ، ورنہ میں...''

''بتاتا ہوں۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ مداری اور آپ میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ وہ جھوٹا

ہوتا ہے اور آپ سچے ہیں۔یعنی جس طرح وہ اپنی ٹوپی، بغل اور گٹھڑی سے غیر متوقع قسم کی چیزیں، مثلاً خرگوش یا انڈے وغیرہ برآمد کرتا ہے، اسی طرح آپ بھی بالکل غیر متوقع قسم کے حادثات اپنے دل میں چھپائے رکھتے ہیں اور پھر مداری کے پٹارے کی طرح معلومات کا دفتر کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔اب یہ پانچ سال پرانا واقعہ جس کا تذکرہ آج آپ فرما رہے ہیں، اب تک آپ کے دماغ میں بیٹھا بیٹھا آخر کیا کر رہا تھا؟ بڑھ رہا تھا، ڈیولوپ ہو رہا تھا؟"

"چپ چاپ سنو۔" خان ہنستا ہوا بولا۔ "یہ حادثہ آج سے پانچ سال پہلے کا ہے اور خلد آباد کے اکثر لوگوں کو پوری طرح یاد ہے۔" خان نے پہلی کشتی ڈوبنے کا حادثہ صرف اسی طریقے سے سنا دیا، جس طرح وہ پانچ سال پہلے اخباروں میں شائع ہوا تھا۔

"وہ حادثہ بھی کشتی الٹ جانے کا معمولی سا حادثہ نہ تھا، بلکہ اس کا تعلق بھی اسی سازش سے تھا۔"

"ہیں...؟ کیا کہتے ہو، میاں؟" نواب صاحب نے مجسم حیرت بن کر آواز لگائی۔

"میں سچ عرض کر رہا ہوں، قبلہ۔" خان بولا۔ "سازش کی بنیاد در اصل آج سے پانچ سال پہلے ہی پڑ چکی تھی اور سازشیوں نے سب سے پہلا حملہ اس کشتی پر کیا تھا، لیکن ان کا یہ حملہ ناکام ہو گیا۔"

"قسم خدا کی، میاں حضور احمد، میرے تو ہوش اڑے جا رہے ہیں۔اس حادثے میں میرے دوست ناصر مرزا کا لڑکا شاکر مرزا بھی ڈوب مرا تھا۔مجھے یاد ہے۔"

"تو پھر آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ شاکر مرزا بڑا اچھا پیراک تھا اور ڈوبنے والوں کی جانیں بچانے کا بھی انعام پا چکا تھا۔"

"ہاں، مجھے یہ بھی معلوم ہے۔" نواب صاحب کے لہجے میں حیرت کا عنصر غالب ہو رہا تھا۔

"تو پھر کشتی الٹنے پر شاکر مرزا کا ڈوب جانا کیا معنی رکھتا ہے۔اگر وہ بدحواسی میں

Akram Allahabadi

دوسرے ڈوبنے والوں کو نہیں بچا سکا تو کم از کم اسے خود تو بچنا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ وہ انورنامی لڑکا بھی اچھا تیراک تھا۔ کشتی پر اس کی تیراکی بھی کچھ کام نہ آئی اور وہ بھی ڈوب گیا۔ اگر یہ کشتی الٹ جانے کا معمولی حادثہ ہوتا تو ان دونوں کو یا ان میں سے کم از کم ایک کو بچ ہی جانا چاہیے تھا۔"

"واللہ، ہم نے تو اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔" نواب صاحب بولے۔

"انورا اور شاکر کے ڈوبنے کی وجہ یہ تھی کہ جھیل میں اچانک بھنور پیدا ہو گیا تھا۔"

"قسم خدا کی، میاں۔" نواب صاحب فخر، حیرت اور خوف سے اپنے پراسرار بھتیجے کو دیکھنے لگے۔

"لیکن، قبلہ۔" بالے بولا۔ "ابھی آپ نے فرمایا تھا کہ ان آٹھوں ڈوبنے والوں کی لاشیں مل گئی تھیں۔ اگر اس حادثے کا تعلق اس سازش سے ہوتا تو لاشیں کس طرح ملتیں؟"

"سازشیوں کا وہ پہلا حملہ تھا۔ وہ زیرِ زمین نکاسی کا راستہ آج سے بیس سال پہلے کی تعمیر ہے اور اس وقت اس کی تعمیر کو پندرہ برس ہو چکے تھے۔ مشین کو آپریٹ کرنے کا کام سازشی اچھی طرح ذہن نشین نہیں کر سکے تھے اور نکاسی راستے کی ساخت اور نوعیت کو بھی پوری طرح نہیں سمجھ پائے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جب اس بدنصیب کشتی کو اپنا پہلا شکار قرار دیا اور جب کشتی لوہے کے گول توے کے اوپر پہنچی اور توا ہٹا تو اس وقت پندرہ سال پہلے بند پڑے ہوئے راستے میں کوئی غیر متوقع گڑبڑ پیدا ہو گئی۔ جھیل میں بھنور پیدا ہوا اور کشتی مع مسافروں کے ڈوبی، لیکن تہ تک پہنچتے پہنچتے تو پھر نکاسی راستے کے دہانے پر آ کر جم گیا۔ اور کوئی مسافر پانی کے دھارے کے ساتھ راستے کے اندر نہ اتر پایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دہانہ بند ہونے کے بعد پانی اپنی جھونک میں بڑی دیر تک بھنور کی شکل میں گھومتا رہا اور آٹھوں افراد کا دم گھٹ گیا۔ وہ سب کے سب مر گئے اور تھوڑی دیر بعد ان کی لاشیں جھیل کی سطح پر تیرنے لگیں۔"

"اور یہ تینوں لڑکیوں کے جسموں سے ساڑھی کس طرح علاحدہ ہو گئی؟" ابراہیم نے سوال کیا۔

Akram Allahabadi

"نہ صرف ساڑھیاں لڑکیوں کے جسموں سے علاحدہ ہوگئیں، بلکہ انھیں پھاڑ کر ایک رسی کی شکل میں باندھا بھی گیا۔ اور ایک ایسی رسی کا سرا ایک لڑکی کی کلائی میں بھی بندھا ہوا تھا۔" خان نے کہا۔

"بات اور بھی پراسرار ہوگئی۔" اسرار بولا۔

"تم میں سے جو یہ معمہ حل کر لے، میں اسے سو روپے کا نوٹ انعام میں دوں گا۔"

"ٹائم پلیز۔" بالے نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک گھنٹا دیتا ہوں۔" خان بولا۔

خان کے سب اسسٹنٹ علاحدہ علاحدہ کمروں میں چلے گئے اور سگریٹ پر سگریٹ پینے لگے۔ ایک گھنٹے تک خان نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ بالے سب سے پہلے آیا اور اس نے ایک اوٹ پٹانگ نظریہ پیش کیا۔ دوسروں نے اس سے زیادہ بے تکی تھیوریاں بتائیں۔ اور خان نے سب کو لعنت ملامت کر کے اصل واقعہ بتایا تو سبھوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

خان نے بتایا۔ "لڑکے چھلانگ مار کر بھنور کے دائرے سے باہر گرنے کی کوشش کر رہے تھے اور چونکہ لڑکیاں اتنی لانگ جمپ اور وہ بھی گھومتی ہوئی کشتی میں سے نہیں کر سکتی تھیں، اس وجہ سے ساڑھیاں پھاڑ کر اور ان کی رسیاں بنا کر جمپ کرنے والے لڑکوں کے ہاتھوں میں ان کا سرا دے دینے کی تجویز ہوئی تھی، لیکن اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا اور بھنور انھیں نگل گیا۔

"آپ کو یہ تمام باتیں کس طرح معلوم ہوئیں؟" بالے نے پوچھا۔

"لانگ فیلو اس وقت حادثے کی رپورٹ لینے آیا تھا اور اس نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ انور اور شاکر دو اچھے تیراک بھی جھیل کے ساکن پانی میں ڈوب گئے۔ اسے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی تو وہ رپورٹ لے کر میرے پاس آیا تھا اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے چلا گیا تھا۔"

"اور آپ اس اس راز کو سینے میں دفن کیے پانچ سال تک خاموش رہے۔" بالے نے بدحواسی سے کہا۔

"اور کیا کرتا؟ اس کے علاوہ میں اس وقت ایسے کاموں میں الجھا ہوا تھا کہ بمبئی سے میرا ایک منٹ کے لیے بھی ہلنا ممکن نہ تھا۔"

"تو مجھے صبح بھیج دیا ہوتا۔" بالے نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور نواب صاحب مسکرا دیے۔

"اور تفتیش کے دوران میں بھی آپ نے کوئی تذکرہ نہیں کیا؟" ابراہیم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"جس وقت مجھے لانگ فیلو کی زبانی یہ اطلاع ملی ہے، اس وقت میں نے اس حادثے کو ظاہری ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ واقعی ایک معمولی حادثہ رہا ہو۔ بہرحال میرے ذہن میں یہ حادثہ اور لانگ فیلو کی رپورٹ محفوظ رہی۔"

"اور لانگ فیلو نے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا؟" اسرار نے کہا۔

"سمجھدار آدمی ہے۔" خان نے جواب دیا۔

"خوب خوب، میاں، تمہارا جواب نہیں ہے۔"

"جس وقت آپ نے مجھے خلد آباد میں بلوایا۔" خان نے نواب صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا۔ "تو میرے حافظے نے پانچ سال پرانا واقعہ مجھے یاد دلایا اور اس میں کچھ تو آپ کی قدم بوسی کے اشتیاق اور کچھ اس قاتل جھیل کا راز سمجھنے کے شوق میں چل کھڑا ہوا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے پھر کامیابی عطا کی۔"

"میری رائے ہے کہ ان آٹھوں مرنے والوں کے عزیزوں کو چل کر یہ خوش خبری سنانی چاہیے کہ مرنے والوں کے قاتل انصاف کے دروازے تک پہنچا دیے گئے ہیں۔" بالے نے مشورہ دیا۔

Akram Allahabadi

"جی ہاں، اور پانچ سال پرانے زخموں کو محض اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے ہرا کیا جائے۔" خان نے کہا۔

"میں نے کتنی بار انھیں سمجھایا ہے کہ بے سوچے سمجھے بیچ میں نہ بولا کرو۔" ابراہیم نے کہا۔

بالے کھانے والی نظروں سے ابراہیم کو گھورنے لگا۔

"اچھا، نوک جھونک بند۔" خان نے ڈانٹا۔ "ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہو، لیکن ذرا سا ڈھیوں والا معمہ نہ حل ہو سکا۔"

سب خاموش ہو گئے، لیکن ایک ہی منٹ بعد بالے کو ایک نیا اعتراض سوجھا۔

"اچھا، خاں صاحب، یہ بتایئے کہ ایک حادثہ ہو جانے کے بعد یہ گروہ کئی سال تک خاموش کیوں بیٹھا رہا؟"

"یہ کوئی سوال نہیں ہوا۔" ابراہیم نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔ "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گروہ والوں نے آٹھوں لاشیں صبح ہونے سے پہلے غائب کیوں نہ کردیں؟ انھیں اس کام کا کافی وقت ملا تھا۔"

"عقل بڑی کہ بھینس؟" بالے نے ابراہیم کو ڈانٹا۔ "جاسوس ہیں آپ؟"

"میرے احسانوں کا یہی بدلہ دیا جا رہا ہے۔" ابراہیم نے رونی صورت بنا کر کہا۔

"ایسے کم عقلوں سے پالا پڑا ہے کہ دو اور دو چار جیسی معمولی بات بھی سمجھانی پڑتی ہے۔ ارے بھائی، اگر وہ لوگ لاشیں غائب کر دیتے تو صبح کو خلدآباد سے آٹھ افراد کے بیک وقت غائب ہو جانے کی وجہ سے کھلبلی مچ جاتی اور ان کی تلاش میں کنوؤں میں بانس ڈلوا دیے جاتے، لیکن لاشیں مل جانے پر اس حادثے کو کشتی الٹ جانے کا ایک معمولی حادثہ سمجھ لیا گیا اور پولیس کی مشنری حرکت میں نہیں آنے پائی۔ اس طرح سے وہ لوگ پوری طرح محفوظ رہے اور انھوں نے لاشیں غائب نہ کر کے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا۔ سمجھے، میاں برخوردار سلمہٗ۔"

''سمجھ گیا۔'' ابراہیم نے مردہ سی آواز میں کہا۔

''اور کئی سال تک وہ لوگ اسی وجہ سے خاموش رہے کہ...''

''لوگ حادثے کو بھول جائیں۔'' بالے نے خان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ایک وجہ یہ بھی تھی، لیکن اصل وجہ کچھ اور تھی۔'' خان نے کہا۔ ''اصل وجہ یہ تھی کہ مشینری میں جو خرابی ہو گئی تھی، یہ لوگ خفیہ طور پر اس کی مرمت کر رہے تھے۔ چونکہ یہ کام انتہائی رازداری سے کیا جا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ انتہائی مشکل اور پیچیدہ بھی تھا، اس وجہ سے ان لوگوں کو مشینری کو کارآمد بنانے میں کافی وقت لگ گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے پہلے حملے سے قبل اس سلسلے میں مشین کا ٹیسٹ لینے کے لیے کچھ تجربے بھی کیے۔''

''تجربے...؟'' ابراہیم اور بالے اور نواب صاحب بیک وقت بولے۔

''جی ہاں، رات کے سناٹے میں کچھ جانور رکھ کر ایک شخص کشتی کو توے کے ٹھیک اوپر چلا کر چھوڑ دیتا اور پھر تیر کر وہاں سے دور ہٹ جاتا تھا، یا کنارے پر چلا آتا تھا۔ اس کے بعد توے کو گردش دی جاتی اور پھر کشتی سمیت جانوروں کے ڈوبنے کا منظر دیکھا جاتا۔ جب مشین حسب مرضی کام کرنے لگی تو ان لوگوں نے اپنی سازش کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔''

''اف، کس قدر بے رحمی اور درندگی ہے۔ میں کہتا ہوں آخر اتنی ہمت، ایسا دل گردہ ان لوگوں کے پاس کہاں سے آ جاتا ہے؟'' نواب صاحب نے سوال کیا۔

''نہ پکڑے جانے کا یقین ان کی ہمتیں بڑھا دیتا ہے۔'' خان نے کہا۔ ''ان لوگوں نے ترکیب ایسی اختیار کی تھی کہ بظاہر ان کا پکڑا جانا ناممکن تھا۔ انھیں اپنے طریقہ کار پر پورا اعتماد تھا۔ انھیں یقین تھا کہ قانون کے ہاتھ ان تک کبھی نہ پہنچ سکیں گے۔''

''ہر مجرم یہی سمجھتا ہے اور ہمیشہ پکڑا جاتا ہے۔'' بالے نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''ہاں۔ اور جرم جتنی ہوشیاری سے کیا جائے، اتنا ہی کوئی نہ کوئی ثبوت باقی رہ جاتا ہے۔ اب آپ شاہد ہی کی مثال لیجیے۔ اس کو پکڑنے جانے کے بعد بھی یقین نہیں آیا تھا کہ وہ

تفتیش کی وجہ سے پکڑا گیا ہے۔" خان نے کہا۔

"شاہد؟" نواب صاحب نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ خان نے مختصراً واقعہ نواب صاحب کو سنایا۔

"میرا خیال ہے کہ اگر لوگوں کو اغوا کرنے کا کوئی اور آسان طریقہ اختیار کیا جاتا تو ہمارے لیے تفتیش میں اور زیادہ مشکلات ہوتیں۔" بالے نے رائے دی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" خان نے کہا۔ "جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں، زیادہ ہوشیاری ہی ایک طرح کی بے وقوفی ہے۔ اتنا لمبا چوڑا طریقہ اختیار کرنے سے بھی ان کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔"

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہے، میاں۔" نواب صاحب فخر سے سینہ تان کر بولے۔ "خدا تمہیں خواجہ خضر کی حیات دے۔ تمہارے ہی دم قدم سے آج مجرم کھل کر سانس نہیں لے سکتے۔ اب اسی انسانیت سوز سازش کو لے لو۔ اگر تم متوجہ نہ ہوتے تو یہ کمبخت نہ معلوم کتنے بے گناہوں کے اعضاءِ جسم کو بیچ ڈالتے اور نہ معلوم کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔"

"میں کس قابل ہوں، چچا جان۔ خدا کی رحمت ہے جو میرے شاملِ حال ہے۔ آپ بزرگوں کی دعائیں ہیں جو مجھے خطروں سے بچاتی ہیں، ورنہ میں تو اب تک کب کا اگلوں میں جا ملا ہوتا۔"

"یہ فن اپنے شاگردوں کو اچھی طرح سکھا دیجیے گا تاکہ آپ کے بعد وہ آپ کا نام روشن رکھ سکیں۔" بالے نے کہا۔

"اماں، کیا باتیں کرتے ہو، بالے میاں؟" نواب صاحب نے تیزی سے کہا۔ "خدا تمہارے استاد کو بہت دن زندہ رکھے۔"

"دیکھ لیا آپ نے، خاں صاحب۔" ابراہیم نے کہا۔ "یہ نالائق آپ کے مرنے کی باتیں بھی سوچ رہا ہے۔ آپ کی جانشینی کے خواب اس کو ابھی سے نظر آ رہے ہیں۔"

Akram Allahabadi

"یہ اس کی سعادت مندی اور خلوص کی دلیل ہے۔" خان نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆ ختم شد ☆☆☆

Akram Allahabadi